فیصل آباد
پاکستان

ماہنامہ

حلیّة

صفر المظفر ۱۴۳۱ھ بمطابق جنوری، فروری 2010ء
www.milliafsd.com

کلمۃ الحبیب

- مکاتیب رئیس الاحرارؒ
رئیس الاحرارؒ کے نام جواہر لال نہرو
- انوارِ انوری
- مشرق و مغرب
- لباس کے شرعی اصول

مدیر اعلیٰ و سرپرست

ابن نفیس مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی
خلیفہ مجاز حضرت سید نفیس الحسینی رحمہ اللہ

حضرت سید نفیس الحسینی قدس سرہ

ہم ہیں اور شوقِ بزم آرائی
وُہ ہیں اور آرزُوئے تنہائی

موسمِ گُل کا اِنتظار نہ کر
اے مِرے ذوقِ بادہ پیمائی

زیست ہے اور غمِ زمانے کے
مَیں ہُوں اور لذتِ شکیبائی

عبدِ قادر[1] ولیِ یکتائی
سیّدی، مُرشدی و مولائی

دونوں عالم ہیں ایک گوشے میں
اللہ اللہ! دِل کی پہنائی

سُن رہا ہُوں بہ گوشِ ہوش نفیسؔ
قلب ہے محوِ نغمہ پیرائی

(۷۸-۱۳۷۹ھ/۱۹۵۹ء)

---

[1] حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ۔ قیامِ پاکستان کے بعد تقریباً ہر سال رائے پور (بھارت) سے متوسلین کی تربیت کے لیے پاکستان تشریف لاتے رہے اور کئی کئی ماہ لاہور و فیصل آباد میں مقیم رہے، اُن سے لاکھوں بندگانِ خدا فیضیاب ہوتے رہے ——
تفصیلی حالات سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی تصنیف "سوانح حضرت عبدالقادر صاحب رائپوری" میں ملاحظہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ ملیہ فیصل آباد پاکستان

ہر اسلامی مہینے کے شروع میں شائع ہوتا ہے۔

صفر المظفر ۱۴۳۱ھ — جلد نمبر 6

بمطابق

جنوری۔فروری 2010ء — شمارہ نمبر 2

فہرست مضامین

فی شمارہ 20 روپے — پاکستان میں سالانہ 200 روپے

سالانہ بدل اشتراک بیرون ملک 40 امریکی ڈالر

رابطہ کے لیے

ماہنامہ ملیہ — جامعہ ملیہ اسلامیہ

محلہ خالصہ کالج P.O مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

041-8711569

0321-6611910

ناشر......حبیب الرحمٰن لدھیانوی — مطبع: ظفر اینڈ فضل پرنٹنگ پریس فیصل آباد — Decl No. 3483-85

کلمة الحبیب

زرداری، سرکاری، اوراب درباری

مفتی حبیب الرحمن لدھیانوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ والصلاة علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

زر (دولت) پاس ہوتو حاکم بننے کو جی چاہتا ہے، سرکی ڈگری ہوتو سرکار بننے کو جی چاہتا ہے۔ یہ سب کچھ حاصل ہوجائے تو پھر بادشاہوں کے دربار لگانے کو جی چاہتا ہے۔

یہ انسان کی ایک ایسی کمزوری ہے کہ اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ ایسے خوش قسمت کم ہی ہوتے ہیں جن کو یہ تینوں رتبے حاصل ہوجائیں۔ ماشاء اللہ ہمارے ملک میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو یہ دو رتبے مل گئے مگر وہ تیسرے رتبے کی آس لگائے رخصت ہوگئے۔ جب تک دربار نہ لگایا جائے تو کسی بھی سرکاری رتبے کا کروفر دکھائی نہیں دیتا۔

زر والے تو بہت سے دیکھے ہیں مگر جن پر دولت عاشق ہوتی ہے اور ٹوٹ کر برستی ہے وہ لوگ بہت ہی کم ہیں۔ مثلاً جب بھی نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر کوئی سودے بازی ہورہی ہو تو کمیشن ان کو بتائے بغیر ہی ان کے بیرونی اکاؤنٹ میں منتقل ہوچکا ہوتا ہے۔ یہ حقیقت اس وقت عام ہوتی ہے جب بھی کوئی ان کا مخالف قوم کے سامنے ان کا یہ راز افشا کرتا ہے تب جاکر بذات خود ان کو خبر ہوتی ہے کہ میرے اکاؤنٹ میں کسی نے نقب لگا کر اتنی رقم جمع کرادی ہے۔

خیر دولت کے بعد ان کے پاس سرکاری عہدے بھی آجاتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی محکمہ کے انچارج بنادیئے جاتے ہیں مگر وہ عہدے ان کے مقام ومرتبہ کے مطابق نہیں ہوتے۔ اچانک ان کی پارٹی کا بڑا قتل ہوجاتا ہے تو اس کے بعد سارا بوجھ ان پر آن پڑتا ہے تب معلوم ہوا کہ سرکاری عہدہ کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ سرکاری عہدہ وہی اہم ہوتا ہے جس میں کروفر موجود ہو۔ جس میں اختیارات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہو۔ مگر ہوا یہ کہ اپوزیشن آڑے آگئی اور مطالبہ کرنے لگی کہ آپ بے اختیار سرکار رہیں۔ آپ کے ہاتھ میں اختیار رہیں اچھا نہیں لگتا۔ دوسرے یہ کہ جب سرکاری معاملہ ہو تو قاعدہ

قانون مد نظر رکھنا پڑتا ہے، جب کہ موصوف کے نزدیک یہ ایک مشکل کام ہے، اور اس میں کروفر بھی نہیں رہتا۔

ہمارے ہاں عدالتوں نے جب سے احتساب کا کام شروع کیا ہے تو ایسے لوگوں کی مشکلات بڑھ گئی ہیں، لینے کے دینے پڑ رہے ہیں۔ قانون اور اس کا فیصلہ ہر وقت آڑے آ جاتا ہے، چنانچہ فیصلہ ہوا کہ اب قانون سے ماورا کوئی ایسا قدم اٹھایا جائے کہ لوگ ہکے بکے رہ جائیں۔ چنانچہ سرکار کی بجائے دربار سجانے کے کا کام اعلان کر دیا گیا۔ دربار بادشاہ سلامت لگاتے ہیں۔ بادشاہ کے زبان سے نکلی ہوئی ہر بات قانون کا درجہ رکھتی ہے، اس کے لئے کسی عدالتی فیصلے کی اہمیت نہیں ہوتی۔

ہندوستان میں بادشاہت ہوتی تھی اور وہاں پر بادشاہ دربار لگایا کرتے تھے، اپنے فیصلے سنایا کرتے تھے، کسی عدالت کی وہاں گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ جو حکم دیتا تھا وہ حرف آخر ہوا کرتا تھا، کسی عدالت میں چیلنج نہیں کی جا سکتا تھا۔ جس کو چاہے قتل کر دے، جس کو چاہے قید کی سزا دے کر جیل میں ڈال کر بھول جائے، جس کو چاہے نواز دے۔ کوئی اس پر اعتراض کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ ہندوستان میں بادشاہوں کے تخت کے مراکز دہلی یا آگرہ ہوتے تھے، اس کے علاوہ بھی کچھ علاقے ہوتے تھے جو کہ پایۂ تخت تو نہ ہوتے تھے مگر بادشاہوں کی تفریح یا انتظامی امور میں معاون ہوتے تھے ان میں لاہور بھی شامل ہے۔

ہندوستان میں پہلے درباری نظام ہوتا تھا، جو کہ بادشاہی نظام کا جزو لاینفک تھا۔ اس کے تحت چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہوتی تھیں جو کہ اپنے علاقے میں درباری نظام کی محافظ ہوا کرتی تھیں۔ بادشاہ عموماً ان پڑھ ہوا کرتے تھے مگر انتہا کے چوکس، نڈر اور شاطر ہوتے تھے۔ ان کے ملازم میر منشی پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ رائج الوقت نصاب تعلیم میں منفرد ہوتے تھے۔ مگر جب انگریز ہندوستان میں آیا تو اس نے درباری بجائے سرکار کا نظام رائج کیا۔ اس نے اپنی تعلیم کو رواج دے کر اس کے پڑھے ہوئے لوگوں کو عہدے دیکر سر کے خطاب سے نوازا۔ چنانچہ یہ دور سرکاری نظام سے متعارف ہوا، مگر انگریز نے یہ ضرور کیا کہ اس نے زرداری اور زمینداری نظام کو قائم رکھا، اور ان کے ساتھ سرکاری افسروں کو منسلک کر دیا۔ گویا کہ انگریز نے تینوں نظام جاری رکھے۔ زرداری، سرکاری، درباری۔ درباری نظام بادشاہوں، زرداری نظام جاگیرداروں، دولتمندوں کی نگہبانی کرتا

رہا اور سرکاری نظام انگریز کی حکومت اور قانون کا محافظ تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بادشاہت ختم ہو جانے کے بعد دو ہی نظام رہ گئے۔ سرکاری اور زرداری۔ سرکاری نظام انگریز نے سنبھال لیا اور زرداری نظام زرداروں، جن میں وڈیرے بھی شامل تھے ان کے پاس آ گیا۔ پاکستان جب بن گیا تو یہ دونوں نظام ہمارے ورثے میں آ گئے۔ ہندوستان نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ انہوں نے اپنے ملک میں جمہوری نظام کو نافذ کر کے ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ مگر ہوا یہ کہ ہمارے ملک کے قیام کی تحریک چلانے والے تمام یا تو زردار تھے یا سر وں کا خطاب حاصل کرنے والے سرکاری تھے۔ ان دونوں کے گٹھ جوڑ سے یہ ملک چل رہا تھا۔ جو لوگ زردار تھے یعنی جاگیردار وغیرہ ان لوگوں نے ابتداء میں اپنی اولادوں کو تعلیم نہیں دلائی یا اگر دلائی تو محض پڑھا لکھا کہلانے کے لئے۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ ہماری اولاد نوکری کیوں کرے اس لئے کہ نوکری تو غریب کرتا ہے ہم تو زردار ہیں۔ مگر جب ان کو نوکر شاہی یعنی سرکار سے واسطہ پڑا تو اندازہ ہوا کہ اصل اقتدار تو ایس پی، ڈپٹی کمشنر، کمشنر کے پاس ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اولاد کو پڑھا لکھا کر ان عہدوں تک پہنچا دیا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں قانونی تعلیم اور گرفت نے ترقی کی تو ان کے ہوش اڑنے شروع ہو گئے۔ اور عدالتوں سے ان کی مرضی کے خلاف نہ صرف فیصلے آنے شروع ہو گئے بلکہ ان کے پرانے وہ مقدمات بھی دوبارہ کھولنے کا اعلان کر دیا گیا۔

چنانچہ اب ہمارے ملک کے صدر جن کے نام کے ساتھ زرداری بھی لگا ہوا ہے اور حقیقت میں بھی وہ زرداری ہیں انہوں نے درباری نظام دوبارہ متعارف کرانے کا اعلان کیا ہے۔ یعنی بادشاہی نظام، جس میں نہ عدالت ہوگی اور نہ ہی بادشاہ کو کوئی پوچھنے والا۔ وہ بھی لاہور جیسے شہر میں۔ جو کہ ہمارے کسی مسلمان حکمران کا باقاعدہ پایۂ تخت نہیں رہا۔ یہ ضرور ہوا کہ یہاں پر ہمارے مسلمان حکمران آئے کچھ عرصہ ٹھہرے یہاں پر شاہی مسجد بنائی، قلعہ بنایا مگر اپنا مسکن نہیں بنایا۔ جبکہ ایک سکھ حکمران رنجیت سنگھ کا پایۂ تخت ضرور رہا ہے۔ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر کے سب سے پہلے بادشاہی مسجد کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا، مسلمانوں کی یادگاریں مسخ کروا دیں۔ رنجیت سنگھ کے درباری کا نام دو تو آتی ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کا ظلم اس کے سامنے شرما جاتا ہے۔ دوسری طرف جن کے مقابلے میں دربار لگایا جا رہا ہے وہ کشمیری مغل ہیں۔ مغل بھی کسی دور میں لاہور پر حکمران رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ معرکہ کون سر کرتا ہے۔

مکاتیب رئیس الاحرارؒ سے

تعدد ازدواج کے موضوع پر

رئیس الاحرارؒ بنام جواہر لال نہرو

ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے کسی بیان میں مردوں کے لیے ایک سے زائد بیوی رکھنے کے متعلق کوئی بیان جاری کیا تھا، تو رئیس الاحرارؒ نے اس کے جواب میں جواہر لال نہرو کو یہ خط لکھا۔

محترم پنڈت جی

تسلیم! آپ کا بیان اخبار میں پڑھا۔ اگر یہ پالیسی بیان نہیں تو بہت ہی اچھا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ باتیں آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔

جب سے نسل انسانی ظہور میں آئی اور جب سے ہمیں انسانی نسل کی معلومات حاصل ہیں، اس وقت سے لے کر آج تک تمام مذاہب اور تمام اقوام جاہل و عالم سب کا یہ متفقہ فیصلہ رہا ہے کہ انسانی نسل کی عظمت کے لیے مرد اور عورت کے درمیان نکاح ضروری ہے۔

نکاح کے بغیر جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے اسے کسی سوسائٹی اور مذہب نے جائز قرار نہیں دیا۔ غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے تعلقات کو ہمیشہ ناجائز تعلقات کہا گیا۔ بلکہ ان تعلقات کو عیاشی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگر تاریخ کے اوراق کو ٹٹولا جائے تو زنا کی سزا تمام مذاہب اور اقوام میں سخت سے سخت رہی ہے۔ بالخصوص اسلام نے زنا کی سزا جبکہ زناکار مرد و عورت غیر شادی شدہ ہوں، سو سو کوڑے مقرر کیے ہیں۔ قرآن عزیز میں فرمایا گیا ہے۔

''بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والے مرد، مارو ہر ایک کو دونوں

میں سے سو سو دُرّے۔ اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم چلانے میں، اگر تم یقین

رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ اور دیکھیں ان کا مارنا کچھ لوگ مسلمان''۔

اسی طرح شادی شدہ اگر ناجائز تعلقات پیدا کریں تو انہیں پتھر مارنے کا حکم ہے۔ فرمایا

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے۔

مسلمان آدمی کا خون جو خدا کی وحدانیت اور میری رسالت کی گواہی دیتا ہو

ان تین وجوہ میں سے ایک وجہ کے بغیر حلال نہیں۔

(۱) جان کے بدلے جان

(۲) شادی شدہ زانی

(۳) دین اسلام کو چھوڑ دینے والا، جماعت سے علیحدہ ہونے والا''۔

اسلام ہی دنیا میں پہلا دین ہے جس نے عورتوں کی تعداد پر پابندی لگائی، کہ چار عورتوں

سے زیادہ کوئی مرد شادی نہیں کرسکتا۔ اور اگر وہ ایک سے زائد شادی کرے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی

عورتوں کے درمیان عدل وانصاف پورا پورا قائم رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

''نکاح کرلو جو اور عورتیں تم کو پسند آویں، دو، دو، تین، تین۔ چار، چار۔ پھر اگر ڈرو کہ ان

میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی نکاح کرو۔ یا لونڈیاں اپنا مال ہے۔ اس میں امید ہے کہ ایک طرف

نہ جھک پڑو گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریگا تو شدید گنہگار ہوگا''۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے چار شادیاں کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہے، بلکہ

اسلام نے اس حکم سے چار سے زیادہ شادیاں کرنے سے قطعی منع فرمادیا۔ اور چار تک شادیاں کرنے کو

جائز قرار دیا ہے نہ کہ ضروری۔

اسلام کا قانون ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت تو دیتا ہے لیکن وہ زنا کی کسی بھی

حالت میں اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کا قانون نفس زنا پر سزا دیتا ہے۔ اور موجودہ مہذب دنیا کے قوانین صرف زنا بالجبر کی سزا دیتے ہیں، مطلق زنا پر نہیں۔ آج کی مہذب سوسائٹی زنا بالرضا کو محبت کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔

یوروپین تہذیب اور مہذب دنیا والے باقاعدہ طور سے ناجائز بچوں کی پرورش کے لیے ادارے کھول رہے ہیں۔ موجودہ دنیا کی مہذب سوسائٹی عورت سے بغیر نکاح کے پیدا شدہ بچوں کے بارے میں سوال نہیں کرتی۔ اور زنا نہ کرنے والے مرد و عورت سوسائٹی میں اپنے لیے ذلت محسوس کرتے ہیں۔

زنا کا جرم یعنی بغیر نکاح کے عورت اور مرد کے تعلقات قتل، چوری، ڈاکہ سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ زانی مرد و عورت سوسائٹی کی طہارت و پاکیزگی اور نسل کی ترقی کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔

غیر شادی شدہ مرد اور عورت جو زنا کار ہوتے ہیں ان کو اور ان کی اولاد کو اگر جنگلی حیوانوں کے سپرد بھی کر دیا جائے تو شاید وہ بھی ان کو قبول نہ کریں۔

نکاح اور اس کے ذریعہ جو اولاد پیدا ہوتی ہے وہ نسل انسانی کو جانوروں اور باقی مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے، ورنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

جو لوگ اور حکومتیں آج یورپ کی تقلید میں ایک عورت سے زیادہ نکاح کو ممنوع قرار دے رہی ہیں ان کا اولین فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے سوسائٹی میں ایسے قوانین بنائیں اور ایسے اخلاق پیدا کریں جس کے ذریعہ زنا ہمیشہ کے لیے رک جائے۔ اور سوسائٹی میں جو بدکاری اور عیاشی محبت کے نام سے ہوتی ہے اس کو بھی جرم قرار دیا جائے۔

جب تک نفس زنا کو جرم قرار نہیں دیا جائیگا اور اس پر لوگوں کو سخت سزائیں نہیں ملیں گی اس وقت تک ایک عورت کے نکاح کی پابندی زنا کاری اور عیاشی کی امداد کرتا ہے۔

دنیا کا تجربہ ہمیں بتا رہا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں ایک مرد کو ایک عورت سے زیادہ کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن ہر مرد و عورت نکاح کے بغیر اپنے تعلقات کو جس طرح چاہیں قائم رکھ سکتے ہیں۔

ہندوستانی زبان میں اس طریق کار کا مطلب یہ ہے کہ ایک سے زیادہ عورت سے نکاح نہ کرو، مگر داشتہ جتنی چاہے رکھو۔

یہ کہنا کہ ایک مرد ایک سے زیادہ عورت سے شادی نہیں کر سکتا، یہ قانون عورت کے حق میں نہیں بلکہ عورت کے خلاف ہے کیونکہ نکاح کرنے سے عورت کا سارا بوجھ مرد کی زندگی پر پڑ جاتا ہے، اور بلا نکاح کے داشتہ کا بوجھ مرد پر نہیں پڑتا، اور نہ اس کی اولاد کی ذمہ داری لیتا ہے۔

ہماری عجیب حالت ہے کہ ہم ہر ایک چیز کو یورپ کی عینک سے دیکھتے ہیں اور اسی دماغ سے سوچتے ہیں۔ حالانکہ سب سے پہلے ہندوستان میں یہ قانون بننا چاہیے کہ کوئی مرد و عورت اٹھارہ برس کی عمر سے لے کر چالیس برس کی عمر تک غیر شادی شدہ نہیں رہ سکتے۔ عورتوں میں خواہ وہ بیوہ ہو یا مطلقہ یا کنواری ہو۔ جب تمام ملک کی عورتیں نکاح کر لیں گی تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ ایک مسئلہ یوں حل ہو جائے گا کہ زنا کاری اور بدکاری ہندوستان میں بند ہو جائے گی۔

اور دوسرے یہ کہ ایک سے زیادہ نکاح کا مسئلہ بھی اس صورت میں حل ہو جائے گا کہ معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان میں تمام مردوں کے شادی کے بعد اب کتنی عورتیں بچ گئی ہیں۔ جب معلوم ہوگا کہ مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہے تو ان کو ایک سے زائد نکاح میں دیا جائے گا۔ تو ایک سے زیادہ نکاح کا مسئلہ خود بخود اس قانون کے بعد ختم ہو جائے گا۔

امید ہے کہ میری ان چند گذارشات سے آپ کو اس موضوع کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

حبیب الرحمن لودیانوی

کوچہ رحمن چاندنی چوک دہلی

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

(اوریا مقبول جان)

کیا کبھی کسی نے سوچا تھا کہ آج سے نصف صدی قبل ایک ماہر معاشیات مالتھس نے جو نظریہ پیش کیا تھا اور جسے چار دانگ عالم میں پذیرائی حاصل ہوئی تھی، وہ اس طرح دم توڑ جائے گا کہ انسانی تہذیب کے سب سے مقبول حصے کی بربادی کا نوحہ بھی تحریر کرتا جائے گا۔ مالتھس نے کہا تھا کہ دنیا کے وسائل ایک، دو، تین اور چار کی رفتار سے بڑھ رہے ہیں اور اس کرہ ارض کی آبادی دو، چار، آٹھ اور سولہ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ یوں ایک دن ایسا آئے گا کہ دنیا انسانوں سے بھرا ہوا ایک ایسا جنگل ہوگی جس میں لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ میسر نہ ہوگا اور وہ ایک دوسرے کو کھانے لگیں گے۔ اس معاشی نظریے کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ پوری دنیا میں بڑھتی ہوئی آبادی کا خوف مسلط ہو گیا۔ سائنسدان تحقیقات میں لگ گئے کہ کس طرح انسانی آبادی کو روکا جا سکتا ہے۔ طرح طرح کی مانع حمل ادویات ایجاد ہوئیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر یہ نت نئی ایجادات میڈیا کی زینت بنیں۔ وہ جو معاشی مجبوری کی وجہ سے کنبہ چھوٹا رکھنا چاہتے تھے انہوں نے تو انہیں کم استعمال کیا لیکن دنیا بھر میں یہ جنسی لذت، آوارہ منشی اور ناجائز تعلقات کے محفوظ راستوں کا بہترین ذریعہ بن گئیں۔ ادھر چھوٹے خاندانوں نے انسانی زندگی میں ایک ایسی خود غرضی اور اپنی زندگی مکمل عیش سے گزارنے کی ایسی رسم ڈالی کہ ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں نے عمر بھر درجنوں شادیاں کیں لیکن اولاد کا جھنجھٹ پالنا گوارا نہ کیا۔ نہ ایک دوسرے کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ زندگی شروع کرنے پر بچوں کے مستقبل کا خوف سوار تھا اور نہ ہی ضمیر کی کوئی ملامت کہ ہم نے اپنی اولاد کی پروا نہ کی اور چھوٹے سے جھگڑے پر علیحدہ ہو گئے۔ معاشی منصوبے کے اس عمل میں وہ لوگ بھول گئے کہ جس نے اس کائنات کو بنایا ہے، اس نے یہاں قیامت تک پیدا ہونے والی مخلوق کی زندگی کے لیے وسائل بھی بہم کر رکھے ہیں۔ اس ساری

منصوبہ بندی کا جو خمیازہ آج مغربی دنیا بھگتنے والی ہے اس سے ان کی راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں۔ آج دنیا میں وسائل تو اسی طرح موجود ہیں لیکن انسان جو اس کرہ ارض کے نظام کو چلانے کے لیے ضروری ہیں، کم ہوتے جا رہے ہیں۔

دنیا کے تمام معاشی اور سماجی سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ کسی بھی تہذیب یا کلچر کو اگر برقرار رہنا ہے تو اسے کم از کم 25 سال تک اپنی آبادی میں اضافے کی شرح کو اس طرح رکھنا چاہیے کہ ہر خاندان میں اوسطاً 2.11 شرح فزودگی (Fertility Rate) برقرار رہے۔ اگر یہ شرح کم ہو کر 1.9 پر آ جائے تو پھر اس تہذیب کی واپسی انتہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ اور اگر 1.3 شرح فزودگی فی خاندان ہو تو ایسی تہذیب صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ ابھی تک دنیا میں کوئی ایسا معاشی نظام موجود نہیں جو اتنی کم آبادی کی بنیاد پر کسی قوم کو مکمل طور پر ختم ہونے سے بچا لے۔ جن قوموں میں یہ شرح فزودگی عام ہو جائے وہاں تمام مانع حمل ذریعوں پر پابندی لگا کر بھی اس تہذیب کو بچانے کے لیے 80 سے 90 سال لگیں گے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ دو خاندان اگر صرف ایک ایک بچہ پیدا کرتے ہیں تو اگلی نسل میں آدھے ایسے ہوں گے جو والدین بنیں گے اور اس سے اگلی نسل میں ایک چوتھائی والدین اس تہذیب میں اگلی نسل چلانے کے لیے باقی رہ جائیں گے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں معاشرے میں بوڑھوں کی تعداد بڑھتی ہے اور ان کی جگہ لینے اور ان کو سنبھالنے کے لیے اگلی نسل میں افراد موجود نہیں ہوتے۔ اس وقت دنیا کے چند ترقی یافتہ ممالک میں یہ صورت حال ہے کہ ان کے پاس اپنے نظام کو چلانے اور اپنے بزرگوں کی دیکھ بھال کے لیے کارآمد نوجوان موجود نہیں۔

پورے یورپ کی 2007ء کی شرح فزودگی فی خاندان اس خطرناک صورت حال کی عکاس ہے۔ فرانس میں یہ شرح 1.8 ہے، انگلینڈ میں 1.6، یونان میں 1.3، جرمنی میں 1.3، اٹلی میں 1.2 اور سپین میں 1.1 ہے۔ یورپی یونین کے 31 ممالک میں کل شرح فزودگی 1.38 ہے۔ یعنی آبادی کی رفتار کی ایک ایسی شرح جس میں کسی تہذیب کا نیست و نابود ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ اس وقت مغرب کے تمام ممالک میں معاشی اور سماجی مفکرین یہ تشویش کو بیان کرتے پھرتے ہیں کہ یہ صرف چند سالوں کی

بات ہے کہ ہم جس یورپ کو آج اس طرح دیکھتے ہیں وہ چند سالوں بعد نظر نہ آئے۔ لیکن یورپ کی آبادی کم نہیں ہو رہی، اس کی وجہ کیا ہے؟

آبادی کم ہوتی ہے تو نظام کو چلانے کے لیے مجبوراً افرادی قوت باہر سے لانی پڑتی ہے، ورنہ سارا نظام دھڑام سے گر جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی آبادی کم نہیں ہو رہی لیکن اس کا حلیہ تبدیل ہو رہا ہے۔ یورپ میں اس خلا کو پُر کرنے کے لیے گزشتہ تیس سالوں میں جتنے افراد آکر آباد ہوئے ان میں نوے فیصد مسلمان تھے۔ فرانس جس کی شرح افزودگی 1.8 ہے اس کی مسلمان آبادی میں یہ شرح 8.1 ہے۔ اس کے بیس سال سے کم عمر بچوں میں 30 فیصد مسلمان ہیں، جبکہ بڑے شہروں پیرس، مارسلز اور نیس میں یہ شرح 45 فیصد ہے۔ جنوبی فرانس جو کبھی کیتھولک عیسائیت کا مرکز تھا وہاں آج مساجد کی تعداد گرجوں سے زیادہ ہے۔ یوں 2027ء تک ہر پانچ میں سے ایک فرانسیسی مسلمان ہوگا اور وہ بھی نوجوان اور پرانے فرانسیسی افراد کے اس دنیا سے چلے جانے اور اپنے پیچھے وارث نہ چھوڑنے کی اگر یہی رفتار رہی تو صرف 35 سال بعد فرانس ایک مسلمان ملک ہوگا۔ گزشتہ 30 سالوں میں انگلینڈ میں مسلمانوں کی آبادی 82 ہزار سے بڑھ کر پچیس لاکھ ہو چکی ہے، یعنی 30 گنا زیادہ۔ پورے برطانیہ میں ایک ہزار مساجد ہیں جو کبھی گرجے ہوتے تھے۔ ان مسلمانوں کی یورپ میں آمد کے بعد ایک اور انقلاب برپا ہوا ہے۔ گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد فرانسیسی اور انگریز آبادی میں اسلام کو قبول کرنے کی شرح بڑھ گئی ہے۔ روزانہ دو سے تین لوگ برطانیہ میں اور تین سے چار لوگ فرانس میں اسلام قبول کرتے ہیں۔ ہالینڈ میں نئے پیدا ہونے والے بچوں میں آدھے مسلمان ہوتے ہیں اور صرف 15 سالوں میں ہالینڈ کی آدھی آبادی مسلمان ہوگی۔ روس میں دو کروڑ تیس لاکھ مسلمان ہیں، یعنی ہر پانچ میں سے ایک مسلمان اور جوانوں کی شرح ان میں زیادہ ہے، اس لیے روس کی فوج میں چالیس فیصد مسلمان ہیں۔ وہ فوج جو کبھی آرتھوڈکس چرچ کی نمائندہ فوج تھی اب مسلم فوج بنتی جا رہی ہے۔ بلجیم میں 25 فیصد آبادی مسلمان ہے اور نئے پیدا ہونے والے بچوں میں 30 فیصد مسلمان ہوتے ہیں۔ بلجیم کی حکومت نے کہا ہے کہ صرف 17 سال تک ہر تیسرا نیا پیدا ہونے والا یورپی بچہ

مسلمان ہوگا صرف ایک ملک میں نہیں پورے 31 ممالک میں۔ جرمنی کی حکومت نے 2007ء میں پہلی دفعہ اپنی مردم شماری پر خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہماری آبادی میں رفتار کی کمی کو روکنا ناممکن ہوگیا ہے اور 2050ء میں جرمنی ایک اسلامی ملک ہوگا۔ جرمن حکومت کے مطابق اس وقت یورپ میں پانچ کروڑ بیس لاکھ مسلمان ہیں اور صرف بیس سالوں میں یہ تعداد دس کروڑ چالیس لاکھ ہوجائے گی۔ امریکہ میں 1970ء میں صرف ایک لاکھ مسلمان تھے جبکہ اب ان کی تعداد ایک کروڑ ہے۔

یہ وہ ترتیب ہے جو بدل رہی ہے اور پورا یورپ اس سے خوفزدہ ہے۔ اس لیے کہ وہاں جانے والا مسلمان تو شاید فرقہ بندی کی زد میں ہو لیکن وہاں پیدا ہونے والا یا اسلام قبول کرنے والا پڑھا لکھا مسلمان ہوتا ہے، جسے اپنے دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے کسی مولوی کے ادارے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی خطیب ہے، خود ہی امام اور خود ہی مجاہد۔ اس میں اس معاشرے کی خوبیاں بھی ہیں، علم بھی اور دین کا ادراک بھی۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ 2007ء میں برطانوی وزیر اعظم اسکوتھ کی پوتی نے اسلام قبول کرتے ہوئے ایک نومسلم انگریز چارلس ایسٹن کی کتاب Islam: The Destiny of Man لہرائی اور کہا کہ اسے پڑھ کر صرف میں نے ہی نہیں بلکہ 14200 اعلیٰ نسل کے لارڈز اور ماہرین نے اسلام قبول کیا ہے، جن میں بی بی سی کے ڈائریکٹر جنرل لارڈ جان تھن برٹ بھی ہے جو اب یحییٰ برٹ ہے اور لیسٹر میں دن رات نومسلم خاندانوں کے بچوں کے لیے اسلامی کہانیاں لکھنے میں مصروف ہے۔ یہ میرے اللہ کی سنت ہے کہ وہ ہدایت کو اس قوم کی طرف منتقل کردیتا ہے جو اس کی اہل ہوتی ہے۔ ہم جو آج مغرب کی مرعوبیت میں حقوق نسواں کی جنگ سے ہی نہیں نکل پاتے، وہی مغرب میں اسلام قبول کرنے والوں میں اکثریت عورتوں کی ہے اور وہ پہلے دن حجاب سے اس کا آغاز کرتی ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے مسلم آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے جان ہاپکنز سکول میں منصوبہ بندی کا عالمی پروگرام شروع کرنے والے سوچتے تو ہوں گے کہ یقیناً اس کائنات کا کوئی خالق ہے، منصوبہ ساز ہے، منتظم ہے جو ان کے منصوبے ان کے منہ پر الٹ دیتا ہے۔

انوار انوری

احوال وواقعات خاتم المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

قسط نمبر:۹

شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد انوری

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حافظ شیرازیؒ کی غزلیں تو ایسی ہیں کہ اس میں شراب کباب کا ذکر ہے تو پھر حافظ شیرازیؒ کو عارف کیوں کہتے ہیں، فرمایا کہ حافظ شیرازی نے کشاف کا حاشیہ لکھا ہے میں نے سورہ کہف تک دیکھا ہے۔ بہت اعلیٰ حاشیہ ہے وہ طبع نہیں ہوا، حافظ کی غزلیں بہت بلند پایہ ہیں ہر شخص ان کو سمجھنے کا اہل نہیں ہے۔ باری تعالیٰ آوارہ لوگوں سے ایسے بلند کام نہیں لیتا۔ جب انہوں نے تفسیر کشاف کا حاشیہ لکھا ہے تو بے ادبی کے الفاظ نہیں کہنے چاہئیں آپ توبہ کرو استغفار کرو۔

جب مولانا حسین علی صاحبؒ واں بھچراں ضلع میانوالی اور حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب کا باہمی تنازع طویل اور پیچیدہ ہوگیا۔ اور حضرت شاہ صاحب کو دیوبند سے دعوت دی گئی۔ یہ جنوری ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے۔ میانوالی کے اسٹیشن پر انسانوں کا ایک سمندر موجیں مار رہا تھا۔ زائرین ایک دوسرے پر گرتے پڑتے تھے۔ اتنے بڑے مجمع کا نظم قائم رکھنا مشکل ہورہا تھا۔ جلسہ گاہ میں پہنچے، ایک ہندو نے اپنے کوٹھے کی چھت پر سے حضرت کو دیکھ لیا، فوراً کود کر زمین پر آیا مجمع کو چیرتا ہوا آیا اور حضرت کے پاؤں میں گر پڑا کہ یہ بزرگ مسلمانوں کے پیغمبر کا نمونہ ہیں، یہ کہا اور ایمان لے آیا۔ ایسے واقعات حضرت کی حیات مبارکہ میں کثیر ہیں۔ یہ واقعہ حضرت مفتی محمد شفیع سرگودھے والوں نے بھی جب کہ لائلپور آپ تشریف لائے تھے احقر سے ملنے کے لئے تو انہوں نے بھی سنایا تھا۔ یہ حضرت مفتی صاحب خلیفہ تھے حضرت مولانا احمد خاں صاحب کندیاں والوں کے یہ اس واقعہ میں خود موجود تھے۔ جب مفتی صاحب مجھے سنا رہے تھے تو اس وقت بہت سے آدمی ان کے ساتھ تھے۔ منجملہ ان کے حاجی قائم الدین لائلپوری بھی تھے۔ جب حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری (بہار) نے قادیانیوں کے خلاف ایک بڑا اجتماع کیا اور تمام حضرات دیوبند تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب فرماتے ہیں کہ اس اجتماع میں حضرت شاہ صاحبؒ مولانا محمد انور صاحب بھی تشریف لے گئے تھے۔ جب سب حضرات سٹیج پر بیٹھے تھے تو ایک برہمن جو خود بھی بہت بڑا ودوان تھا، حضرت شاہ صاحب کو دیکھ کر مجمع چیرتا ہوا حضرت شاہ صاحب کے پاس آکر کھڑا ہوگیا، اور کہا کہ آپ کے چہرے

سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے بہت بڑے مولوی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ نہیں میں تو ایک طالب علم ہوں۔ پھر اس برہمن کو حضرت شاہ صاحب سے عشق ہوگیا وہ تمام جلسے میں ساتھ ہی رہا۔ ہم بھی حیران تھے کہ اس کو کیوں اتنا تعلق ہے۔ یہ واقعہ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ نے بہاولپور کے مقدمے کے اجتماع پر بھی سنایا تھا۔

مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل کی امداد کے سلسلے میں رنگون تشریف لے گئے۔ وہاں کے اہل خیر نے مدرسہ کی خوب امداد فرمائی اور حضرت کے مواعظ حسنہ سے مستفیض ہوئے۔ واپس ڈابھیل تشریف لا کر تمام مدرسین کی دعوت کی۔ پر تکلف کھانا کھلایا اور ہر مدرس کو ایک ایک رومال رنگونی اور دس دس روپے عنایت فرمائے۔ مولانا احمد بزرگ رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل ضلع سورت جب تنخواہ لے کر حاضر خدمت ہوئے تو فرمایا کہ تنخواہ نہیں لوں گا، اہل رنگون نے احقر کی بہت خدمت کردی تھی یہ تنخواہ آپ واپس لے جائیں۔

حضرت مولانا احمد سعید صاحب مرحوم دہلی سے بعض دفعہ علمی اشکالات دریافت کرنے دیوبند حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ جواب دینے کے لئے تیار ہی بیٹھے تھے۔

مولانا خیر محمد صاحبؒ، مولانا خیر الدین سرسوی مرحوم، مولانا غوث محمد صاحبؒ، مولانا عبدالجبار صاحبؒ، مولانا محمد صدیق صاحبؒ وغیرہم یہ سب حضرات احقر سے ملیر کوٹلہ میں کہنے لگے کہ حضرت شاہ صاحب کا صبح کو فجر کی نماز کے بعد درس کراوے، تو عرض کر سکے ایک مطعلانی کا واقعہ متعین جمع کو ادا کرنے کا۔ جس حدیث میں واقعہ مذکور ہے اس حدیث کے متعلق تحقیق کرانا ہے۔ احقر نے عرض کیا کہ یہ حضرات علماء چاہتے ہیں کہ حضرت کا درس سنیں فرمایا بہت اچھا لیکن میں حدیث باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درس دوں گا اور خود ہی تلاوت کروں گا کہ ہمارے مشائخ کا یہی معمول رہا ہے چنانچہ سینکڑوں علماء جمع ہوگئے۔ مولانا مفتی خلیل صاحب بھی بیٹھے تھے۔ مولانا عبدالغنی صاحب بخاری شریف لائے کہ میں بھی حضرت کا تلمیذ بننا چاہتا ہوں۔ حضرتؒ نے ان کو بخاری شریف شروع کرادی اور درس حدیث دیا۔ علماء حیران تھے علوم کے دریا بہہ رہے تھے ایک سکتہ کا عالم تھا۔ پھر سایک مطعلانی کا واقعہ بھی ذکر فرمادیا کہ علماء کی تسلی ہوگئی۔ مولانا عبدالجبار مرحوم فرماتے تھے کہ امام بخاری ایسا درس دیتے ہوں گے۔ مولانا خیر محمد صاحب فرمانے لگے کہ علم تو حضرت شاہ صاحب کے سینے سے اچھل کر باہر آتا ہے۔ افسوس کہ ہم تو دیو بند جانے کے دوری سے چھپنے پڑے حضرت کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا۔ مولانا خیر الدین مرحوم حضرت کو سنا رہے تھے کہ جب آپ مدرسہ امینیہ میں تھے تو میری ابتدا تھی اور حضرت دہلی سے کشمیر جارہے تھے۔

بطلِ جلیل کا سانحۂ رحیل

مولانا حمید الرحمٰن، راولپنڈی

فاطرِ کل کائنات کا یہ ایک ازلی اور ابدی اور اٹل و محکم فیصلہ ہے کہ جو فرد بشر اس دنیا میں آئے گا وہ بہر کیف ایک نہ ایک دن ضرور جا کر رہے گا۔ اور پھر اس کے دنیوی اعمال کی روشنی میں اس پر جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ لگایا جائے گا۔ اگر جانے والے کے عقائد صحیح و درست ہوئے، معاملات راست ٹھہرے اور اعمال صالحہ زیادہ قرار پائے تو لاریب وہ اپنے خالق و مالک کا ضیف خصوصی ٹھہرے گا۔ اور زمرۂ ضیف الرحمٰن میں شامل ہو کر جنت نامی دار الضیوف میں ہمیشہ کے لئے داخل کیا جائے گا۔ اور اگر خدا نہ خواستہ عقائد غیر صحیح ہوئے معاملات درست نہ نکلے اور اعمال و افعال معیاری نہ گردانے گئے تو وہ اللہ کے بنائے ہوئے آئین کا باغی سمجھا جائے گا۔ وہ بلاشبہ جہنم نامی دار السجن میں اپنے کیے کی سزا پائے گا۔ یہ رب العالمین کے کلام برحق کا سرسری حکم ہے حاملین کلام برحق کا مسلمہ نظریہ ہے۔ اور جو اس نظریہ کا حامی نہیں ہے وہ مسلمان کہلانے کا حقدار نہیں۔ مگر اس عالم رنگ و بو میں کچھ ایسی بوقلمی و ہمہ رنگ ہستیاں بھی ہوئی ہیں جن کی طلسماتی و متنوع شخصیت کے جدا ہونے کا بھولے سے بھی خیال تک ذہن میں نہیں آتا۔ اور ان کے چاہنے والے ہمیشہ سے یہی چاہتے ہیں کہ ہم دائمی طور پر ان کے سنگ رہیں۔ سنگت میں کچھ بھی شگاف نہ آئے۔ مگر تا بکے۔ جب ناگہانی طور پر ان کی جدائی وارد ہوتی ہے اور اچانک انکی سنگت ہجر و فراق کی ورنگ زنی کی لپیٹ میں آن کر اپنی ہستی کھو بیٹھتی ہے تو ان کے متعلقین کو یقین نہیں آتا۔ کئی مجبور دلخواس ہو کر اس سے عاری ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی قوی القلب یقین کر بھی لے تو غم و اندوہ کے صدمے سے حواس باختہ و بدحال ہو جاتا ہے۔ اور بچھوڑے کا تصور بھی اس کے لئے سوہان روح سے کم نہیں ہوتا۔ وہ سودائیوں کی طرح سوچتا ہے کہ کیا کرے مگر کچھ سوچ نہیں سکتا اور نہ اس کا دماغ سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے اپنی زندگی ویران محسوس ہوتی

ہے۔ یہاں سے جانے والا خواہ کسی بھی مرتبے پر فائز ہو وہ دوبارہ دنیا میں واپس نہیں آ سکتا اور نہ ہی آنے کا اختیار رکھتا ہے۔

حضرت مولانا عبدالجلیل رائے پوری خلیفہ مجاز حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کا شمار بھی انہی نفوس قدسیہ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں لاتعداد خوبیوں سے بہرہ ور کیا تھا۔ ان گنت اوصاف سے متصف اور متنوع کمالات سے کامل اکمل فرمایا تھا۔ آں موصوف اس وقت ارف خانوادہ رائے پوری کے سرخیل وگل سرسبد ہی نہیں سلسلہ رائے پوری کے فرد فرید اور روح رواں کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ اور برصغیر پاک وہند میں شاید ہی کوئی اب ان کا ہم مرتبہ خانقاہ رائے پوری میں ہو۔

میرا باقاعدہ طالب علمی کا زمانہ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۱ء تک کے عرصے کو محیط ہے۔ اور اسی عرصے میں ہی غالباً پہلی بار آں مخدوم سے بایں انداز و الفاظ غائبانہ متعارف ہوا تھا کہ دو بزرگ جو آپس میں قریبی رشتہ دار ہیں متبحر عالم، مظاہر العلوم سہارن پور کے فاضل، صوفی باصفا، طبعاً خلوت گزیں اور راسخ فی العلم ہیں نیز دونوں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کے خلیفہ مجاز بھی ہیں اور قرابت قریبہ بھی رکھتے ہیں کہ ایک ان کے برادرزادے ہیں اور دوسرے خواہر زادے۔ یہ دونوں جہاں باہم دو جان و یک قالب کی سلک سے منسلک اور ایکدوسرے کے ساتھ بلا کی مماثلت رکھتے ہیں، وہاں اپنے شیخؒ کے صوری و معنوی عکس جمیل بھی ہیں۔ ایک مولانا عبدالوحید کے نام سے موسوم اور دوسرے مولانا عبدالجلیل کے نام سے معنون کیے جاتے ہیں۔

تعارف کرانے والے جہاوریاں کے مرحوم دوست قاضی محمود الحسن تھے جو تبلیغی بزرگ مولانا قاضی عبدالقادرؒ کے فرزند ارجمند تھے اور میرے ہم مکتب وہم مشرب ساتھی و رفیق کار تھے۔

اس وقت مستی کا دور تھا اور طالب علمی کا زمانہ۔ اس دور میں محض عمری ناپختہ نہیں ہوتی، سوچ وفکر، شعور وادراک اور عقل وفہم وغیرہ ہر اعتبار وہر پہلو سے ناپختگی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں انسان سود وزیاں ہی نہیں بلکہ احساس زیاں سے بھی عاری ہوتا ہے۔

غرض اس تعارف کو بے اعتنائی کے کانوں سے سنا اور غفلت شعار یہ دو سری کا نذر

کر دیا۔ لیکن کلاچی نے نیا ماحول مہیا کرنے سے قاصر رہا اور گاہ گاہ ان کا نام و تذکرہ گوش حق نیوش کی راحت رسانی کا سامان بنتا رہا۔ اور دل و دماغ کو انگیز اتھل پتھل کرتا رہا۔ تا آنکہ نوے کی دہائی آن پہنچی اور میں نے حضرت الشیخ ڈاکٹر محمد حسین للہی کی فاضلانہ تصنیف لطیف ''حیات طیبہ'' کی خود ان کے ایماء و حکم پر ''نکات طیبہ'' کے نام سے تلخیص کی۔ جسے خانقاہ چشتیہ نظامیہ للہ شریف کی طرف سے بڑے خوبصورت انداز میں شائع کیا گیا اور حضرت للہی نے اس کے چند نسخے حضرت مولانا عبدالجلیل کی خدمت اقدس میں ارسال فرمائے۔ آں مخدوم و معظم نے انہیں نہ صرف شرف قبولیت بخشا بلکہ پسندیدگی کے ساتھ ساتھ اپنے حلقہ میں تقسیم بھی کیا۔ اور ملخص کے حق میں کلمات خیر ارشاد فرمائے، ڈھیروں دعاؤں سے نوازا اور ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس پر حضرت للہی نے مجھے ان کے اشتیاق ملاقات سے آگاہ کیا اور حکم فرمایا اپنی پہلی فرصت میں ڈھڈیاں شریف جانے کا پروگرام بناؤ اور جتنا جلد ہو سکے حضرت کے دیدار و زیارت کی سعادت حاصل کرو۔

آداب محفل سے بے بہرہ، احترام بزرگاں سے ناآشنا، اور ادب و تمیز خورد و کلاں سے قطعی نابلد۔ ایسے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میری کوئی حرکت شنیع یا قول قبیح بد اعمال کا موجب نہ بن جائے اور مجھے لینے کے بر عکس دینے نہ پڑ جائیں۔ اگر معظم و مکرم مناسب سمجھیں تو جب آپ ڈھڈیاں شریف تشریف لے جانے کا ارادہ و قصد فرمائیں تو اس کودک کو بھی اپنے ہمراہ لے جائیں تاکہ اچھوں کے سنگ و سنگت میں ہم سنگ ہو کر میں بھی کہہ سکوں اچھے سنگ تیرے۔ حضرت للہی یہ سن کر خوب محظوظ ہوئے اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا! اچھا، ذرا خود کو جانے کے لئے تیار رکھنا اور میرے پیغام کے لئے گوش بہ آواز رہنا۔ جونہی فرصت و موقع ملے گا چلے چلیں گے۔ مگر بسا آرزو کہ خاک شدی۔ اتفاقات زمانہ بھی عجیب ہوتے ہیں اور قضا و قدر کے فیصلے ہی انسانی تدبیر و تفکر پر ہمیشہ غالب آتے ہیں۔ اور سچ کہا کہنے والے نے ''تدبیر کند بندہ تقدیم زند خندہ'' چنانچہ میرے ساتھ بھی عجیب اتفاق امر کا ظہور ہوا کہ جب چند دنوں کے بعد حضرت الشیخ للہی کا آگہی سندیسہ سمع طراز ہوا تو میں اپنے زمین بستر و مسکن سے سینکڑوں کوس دور کوہستان کی کوہ پیمائی میں بردوش سفر تھا۔ ایسے میں سوائے قہر درویش بر جان

درویش اور کیا ہو سکتا تھا۔ گزر رہا ہوں جہاں سے مسافروں کی طرح۔ یہ راستہ مجھے منزل کی آگہی دے گا۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد بھی اسی طرح کا سانحہ پیش آیا۔ اور تقریباً چار پانچ برس اسی لیت و لعل میں گزر گیا۔ اسی دوران حضرت لطفیؒ بھی آں مخدوم کے ہاں تشریف لے گئے۔ بقول حضرت لطفیؒ آپ نے میرے بارے میں ضرور استفسار فرمایا ہے۔ ملنے کی خواہش ظاہر کی اور ڈھیروں دعائیں دی ہیں۔ اور یہ سب کچھ فیضان تھا اس نسبت عالیہ کا جو کمالات طیبہ کے حوالے سے اس ہیچمدان کے ہاتھوں ورطۂ تحریر میں لائی گئی ہے۔ عارف شیرازی نے شاید اسی موقع کے لیے کہا تھا۔

دیدم گل تازہ چند دستہ   بر گنبد از گیاہ بستہ

گفتم چہ بود گیاہ ناچیز   تا در صف گل نشیند نیز

بگریست گیاہ و گفت خاموش   صحبت نکند کرم فراموش

گر نیست جمال و رنگ و بویم   آخر نہ گیاہ باغ اویم

تلك الليالي التي اعدوت من عمري   مع الاحبة كانت كلها عرساً

گرچہ دانم کہ بجائے نبرد راہ غریب   من بہ بوئے خوش آں زلف پریشاں بروم

انشاء اللہ تعالیٰ بفضلہ و منہ

اور حضرت جامیؒ نے تو کمال کر دیا ہے فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں۔

نسبت خود بہ سگت کردم و بس منفعلم   زانکہ نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی

اور آخر حضرت کا تصرف بے پایاں اور شفقت لا متناہی کی طلسماتی کشش نے اپنا کرشماتی اثر دکھایا اور یہ بندہ پر بے کاہ کچے دھاگے سے بندھا ان کے حضور حاضر ہو گیا۔ شیخ لطفیؒ کی معیت کے ساتھ ساتھ چند دیگر حضرات و رفقاء کی رفاقت بھی حاصل تھی اور حضرت لطفیؒ نے بذریعہ ہاتف حضرت قاری مظفر حسین زید مجدہ کو اپنے آنے کی اطلاع بھی کر دی۔ چنانچہ جب ہم آپ کی خدمت اقدس میں پہنچے اور آپ کے رخ زیبا پر میری پہلی نظر پڑی تو لا ریب میرا دل پکار اٹھا کہ یہ کوئی بشر نہیں بلکہ ملک کریم ہیں۔ اگر واقعۃً انسان ہیں تو ان انفاس نفیسہ اور قدسی صفات انسانوں میں سے ہیں جو قرنہا قرن

پہلے گزر چکے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جب اس انسان کو دیکھا جو سراپائے انس ومودت تھے تو خود اپنے انسان ہونے پر رشک ہونے لگا۔ ان کی بے داغ معصومیت اور بے لاگ بھولے پن نے کتنی دیر ششدر و حیران کئے رکھا۔ حضرت ملتانی نے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ حضرت یہ حمید الرحمن ہے اور آپ کی زیارت کے لئے پہلی بار ڈھڈیاں شریف میں حاضر ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو میرے من میں بستے اور دل میں رہتے ہیں۔ میں ان کی تلخیص لطیف موسوم بہ نکات طیبہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہوں۔ اور پھر فوراً بازو پھیلا کر اس نالائق کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ شفقت ومودت سے نوازا۔ اور فرمایا آپ نے حیات طیبہ کی تلخیص کیا کی، گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ زبان نہایت سلیس وسادہ اور انداز واسلوب جی میں اترنے والا اختیار کیا۔ میں نے اسے متعدد بار سنا اور ہر بار نیا حظ اٹھایا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ جو کچھ ہو پایا ہے وہ محض اللہ کے لطف وکرم کا کرشمہ، صاحب حیات طیبہ کی کرامت اور شیخ ملتانی کے تصرف وتوجہ کا اعجاز ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

خود کو بھول گیا ہوں تب سے   تو نے اپنا بنا لیا ہے جب سے

آں مخدوم کے سراپا پر اولین نگاہ کے بعد رنگ بہ رنگ شخصیت کی جو جھلکی جلترنگ لوح خاطر پر سروری صورت میں ثبت ہوئے ہیں وہ کچھ اس طرح کے تھے۔

میانہ ومعتدل قریب الطویل قامت، اکہرا گٹھا ہوا گداز بدن، جاذب وحسین نین نقش، گندمی و مائل بہ صباحت رنگت، مسنون ومتناسب سفید داڑھی، فراخ جبین، گہری فکر انگیز آنکھیں، ستواں سیدھی ناک، غنچہ دہن، ہموار وکشادہ ابرو، باوقار وسنجیدہ نورانی چہرہ، پرجوش وپاٹ دار سا آواز۔

آنکھوں میں شرم وحیا کا ہالہ، پیشانی پر علم وعمل کی تابانی، اور چہرہ پر تزکیہ وتقویٰ کا نور۔ نہایت سادہ وارزاں مگر اجلی وسفید پوشاک اور سر پر کم قیمت وسفید کپڑے کی سلی ہوئی ٹوپی۔

پیری وصد عیاری کے بمصداق پیرانہ سالی نے ان کے جسم وجثہ کو امراض جسمانی کی آماجگاہ اور چلتا پھرتا ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا تھا۔ تاہم جہاں تک استقلال واستقامت، ایمان وایقان وصبر و

ثبات کا تعلق ہے تو لاریب وہ کوہ ہمالیہ سے بھی زیادہ عظمت وعزیمت کے مالک نظر آتے ہیں تو برسوں سے خوراک غذا کے معاملے میں مستغنی الطبیعت ہو گئے تھے۔ اور ایسا لگتا تھا کہ الرزاق ذوالقوۃ المتین ہی انہیں اپنے مطبخ خانہ غیبی سے غائبانہ طور پر کھلاتا پلاتا اور اسباب حیات سے بے نیاز فرما کر محض اپنے لطف وکرم سے رشتِ زیست باقی رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ روز ایک انڈے اور ایک کپ چائے یا دودھ قوت لایموت کا بھرم قائم رکھیں ناممکن ہے۔

اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمت الی النور یعنی اللہ ان اہل ایمان کا ولی وکارساز ہے جنہیں وہ جہالت وضلالت کی ظلمتوں سے محفوظ فرما کر ایمان ایقان کا نور عطا فرماتا ہے۔

آپ کی اپنے وقت کے جید ونامور حافظ حضرت حافظ محمد خلیلؒ کے گھر میں ولادت باسعادت ہوئی۔ یگانہ روزگار اہل اللہ حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری کی مربیانہ صحبت ومسیحائی میسر رہی اور محدث کبیر حضرت محمد زکریا کاندھلویؒ کی تلمیذ وشاگردی کی نعمت غیر مترقبہ حاصل ہوئی۔ جنہیں اپنے بابا کی صبغہ قرآنی میں رنگی ہوئی پر رنگ مشفقین مشفق دادا کیا اسوۂ نبوی کے قالب میں ڈھلی ہوئی مربیانہ محبتیں اور محبوب ومکرم استاد کی ارجمند وحنفی اوصاف سے متصف کریمانہ توجہیں حاصل ہو جائیں۔ کوئی اندازہ کر سکتا ہے یا کسی کے حاشیہ خیال میں آسکتا اور اس کے دل ودماغ میں سما سکتا ہے۔ اس کے اجلے وضو پذیر قلب صافی کی زرخیزی میں کیسے کیسے حسن وجمال کے گل وبل کھلیں گے، کیسے کیسے قوس قزحی رنگی رعنائیاں دکھائیں گے۔ اور کیسے کیسے خوبصورتی کے رنگ بکھیریں گے۔ سا ممکن اسے قسمت کی یاوری بھی کہا جا سکتا ہے۔ اولاد کے حق میں آباء کے صلہ کی حسنات کاری بھی صحبت صالح کی فیاضی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اور جوہر شناس استاد کی پارس سے کندن بنانے والی نظر نوازی بھی اور پھر جب ان فیضان نظر وکرامت مکتب کے سنگم وامتزاج کے بعد اصلاح پر مزاج صلاح گیر طبیعت، عملی زندگی وروحانی دنیا میں کہاں تک پہنچ سکتی ہے اور کیونکر ترقی کے مدارج طے کر سکتی ہے اسے نہ تو الفاظ کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی برہان مبرھن سے دہرایا جا سکتا ہے۔ آپ نے ۱۳۶۰ھ میں

مظاہر العلوم سہارنپور سے سند فراغت حاصل کی ہے اور اس کے بعد اپنے عظیم المرتبت تایا ئے محترم حضرت رائپوری جو ہر قسم کی اولاد ماد ینہ سے فارغ البال تھے کے سایہ عاطفت میں سلوک و احسان کی منزلیں طے کیں اور ان کے حسین حیات بائیس برس تک سفر و حضر جلوت و خلوت اور شبانہ روز صحبتی کی حیثیت سے ہم سنگ تیم رہے۔ یہاں تک کہ اس قابل رشک بزرگ کی لائق رشک زیست کی ہم جلیسی کے طفیل خود بھی قابل رشک بزرگ بن گئے۔ کیا خوب کہا ہے کہنے والے نے۔

آنا نکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند

آیا بود کہ گوشہ چشمہ بما کنند

اور جب حضرت رائپوریؒ نے انتقال فرمایا ہے تو اس کے بعد ساری زندگی انہی چھوڑے ہوئے نقوش جاوید اس پر پابہ جولاں اور انہی کے طے کردہ خطوط سرمدی پر گامزن رہے ہیں اور مجال نہیں کہ ان کے جادۂ حق سے سر مو اعراض و انحراف کیا ہو۔ ہمیشہ گوشہ گمنامی کو کنج عافیت جانا اور زندگی بھر اسی میں مست اور اسی میں مگن رہے۔ شہرت و ناموری سے کوسوں دور اور تبلہ و طب کوئی سے متنفر ہے۔ طبیعت اصول پسندی کی خوگر تھی اور مزاج نظم و ضبط کا حامل اور جہاں تک بے نفسی و سادہ مزاجی، انکساری و تواضع اور خاکساری و عجز کا تعلق ہے تو لاریب وہ اپنے تایا کا عکس معکوس اور شیخ و مربی کا ایسا پرتو کامل تھے کہ اس پر اصل کا گمان لگتا تھا۔ حضرت مظہر جان جاناںؒ کے متعلق کہیں پڑھا تھا۔

''عاش حمیداً و مات شہیداً''۔ ان کی حیات بھی لائق تعریف تھی اور ممات بھی قابل رشک کہ جب تک بقید حیات رہے اللہ کے دوست و محبّ بن کر رہے اور جب اس دنیائے دوں سے رخصت ہوئے تو جادۂ شہادت پر گامزن ہو کر سیدھے جنت کو سدھار گئے۔ انہی کے مثیل ہمارے ممدوح مخدوم بھی تھے کہ ساری زندگی جنت کے قرین اور لائق تقلید رہے اور وقت آخر آیا تو ایک ہی جست میں دخول بہشت بریں ہو گئے۔ مؤذن نے ظہر کی اذان شروع کی اور آپ نے اذان کا جواب دینا شروع کیا جب مؤذن نے اشہد ان محمد رسول اللہ کہا تو انہوں نے بھی جواباً اشہد ان محمد رسول اللہ دھرایا اور ساتھ ہی روح

قفسِ عنصری سے پرواز کر گئے۔ وہ نیرِ تاباں جو ۱۹۲۰ء میں مطلعِ انوار ہو کر ایک جہاں عالمتاب کو اپنی تابانی وضوفشانی سے شمعِ نور بنائے ہوئے تھا آخر ۱۲ نومبر ۲۰۰۹ء بمطابق ۲۳ ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ ۸۹ بہاریں بتا کر ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

خدا رحمت کند ایں پاک طینت را

راقم آثم کو حضرت علیہ الرحمۃ سے چار دفعہ شرفِ تلمذ کی سعادت حاصل ہوئی ہے، دو دفعہ حضرت الشیخ قاضی نور اللہ مرقدہ کی معیت میں اور دو بار ان کے انتقال کے بعد دیگر احباب کی ہمراہی۔ اگرچہ ہر بار ایک لمبے عرصہ کے بعد ہمیں جانا ہوا مگر حیرت ہے کہ تمام اعضاء و جوارح کے ناتواں و مضمحل اور جسم و جثہ کے ضعیف ولاغر ہونے کے باوجود، دل و دماغ کو ہمیشہ حاضر و مستعد اور قوتِ حافظہ و یادداشت کو چاک و چوبند ہی پایا ہے۔ سوءِ حفظ اور نسیان و ذہول کے مرض سے زندگی کے آخری لمحات تک محفوظ رہے اور بھول کر بھی بھولنے کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہی ہے جو امام شافعی نے اپنے سوءِ حفظ کی شکایت حضرت امام وکیع کے حضور "شکوت الی وکیع سوء حفظی" کے الفاظ میں کی ہے۔ اور انہیں جواباً حضرت وکیع نے فرمایا ہے کہ "اگر تم چاہتے ہو کہ سوءِ حفظ کی مرض سے محفوظ اور نسیان و ذہول سے مامون رہو تو ترکِ معاصی اور اللہ کی نافرمانی سے اپنے دامن کو آلودہ نہ ہونے دو" اور لگتا ہے آں مخدوم نے اوائلِ عمری میں ہی خود کو ہر طرح کی آلودگیوں سے ہمیشہ بچایا ہے۔ اور اللہ نے بطور انعام حسنِ حفظ کے نور سے زندگی کے آخری لمحات تک آپ کے دل و دماغ کو منور رکھا ہے۔

غرض آخری بار سانحہ ارتحال سے تقریباً دو تین ماہ پہلے حاضری دی ہے۔ اس وقت بالکل مشتِ استخواں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ عمل و کردار کے لحاظ سے تو مہاتما تھے ہی لیکن تن بدن کے اعتبار سے بھی انہی کے مثیل دکھائی دیتے تھے۔ نقاہت و کمزوری کے باعث غنودگی و غنودگی طاری تھی۔

اللہ تعالیٰ درجات کو بلند فرمائے۔

لباس کے شرعی اصول

حاجی مختار احمد

غیرت ایمانی کا تقاضا ہے کہ مسلمان زندگی کے دیگر معاملات کی طرح لباس میں بھی شرعی احکام کا خیال رکھے۔ آدمی کا کوئی لباس واجب ہوتا ہے، کوئی مستحب، کوئی حرام، کوئی مکروہ اور کوئی مباح۔ آدمی کو لباس کے وقت اہتمام سے مندوبات کی طرف رغبت اور مکروہات سے اجتناب ہونا چاہئے۔

واجب وہ لباس ہے جس سے ستر چھپایا جائے۔ مندوب وہ ہے جس کے پہننے کی شریعت میں ترغیب آئی ہو جیسے عمدہ کپڑا عید کے لئے اور سفید کپڑا جمعے کے لئے۔ مکروہ وہ ہے جس کے نہ پہننے کی ترغیب آئی ہے، جیسے غنی کے لئے ہمیشہ پھٹے پرانے کپڑے پہننا۔

حرام وہ ہے جس کے پہننے کی ممانعت آئی ہے جیسے مرد کیلئے ریشمی کپڑا بلا عذر پہننا۔ (خصائل نبوی)

لباس کے دو فائدے

ایک ستر پوشی، دوسرے سردی گرمی سے حفاظت اور آرائش بدن۔ پہلے فائدے کو مقدم کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ انسانی لباس کا اصل مقصد ستر پوشی ہے اور یہی کام عام جانوروں سے امتیاز ہے کہ جانوروں کا لباس جو قدرتی طور پر ان کے بدن کا جز بنا دیا گیا۔ اس کا کام صرف سردی گرمی سے حفاظت یا زینت ہے، ستر پوشی کا اس میں اہتمام نہیں البتہ اعضائے مخصوصہ کی وضع ان کے بدن میں اس طرح رکھ دی ہے کہ بالکل کھلے نہ رہیں کہیں ان میں دم کا پردہ کہیں دوسری طرح کا۔

اور جو حضرت آدم و حوا علیہم السلام اور اغواء شیطانی کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لباس کے ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے لئے ننگا ہونا اور قابل شرم اعضاء کا دوسروں کے سامنے کھلنا انتہائی ذلت و رسوائی اور بے حیائی کی علامت اور طرح طرح کے شر و فساد کا مقدمہ ہے۔ (معارف القرآن)

انسان پر شیطان کا پہلا حملہ اس کے ننگا کرنے کی صورت میں ہوا۔ آج بھی شیطانی تہذیب انسان کو

برہنہ یا نیم برہنہ کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شیطان کا سب سے پہلا حملہ انسان کے خلاف اسی راہ سے ہوا کہ اس کا لباس اتر گیا اور آج بھی شیطان اپنے شاگردوں کے ذریعے جب انسان کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تو تہذیب و شائستگی کا نام لے کر سب سے پہلے اس کو برہنہ یا نیم برہنہ کر کے عام سڑکوں اور گلیوں میں کھڑا کر دیتا ہے اور شیطان نے بزعم خویش جس کا نام ترقی رکھ دیا ہے وہ عورت کو شرم و حیا سے محروم کر کے منظر عام پر نیم برہنہ حالت میں لے آنے کے بغیر حاصل ہی نہیں ہوتی۔

ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض ستر پوشی ہے

شیطان نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپ کر پہلا حملہ انسان کی ستر پوشی پر کیا، تو شریعت اسلام میں جو انسان کی ہر صلاح و فلاح کی کفیل ہے۔ اس نے ستر پوشی کا اہتمام اتنا کیا کہ ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض ستر پوشی قرار دیا۔ نماز، روزہ وغیرہ سب اس کے بعد ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص نیا لباس پہنے تو اس کو چاہئے کہ لباس پہننے کے وقت یہ دعا پڑھے۔

الحمد للہ الذی کسانی ما اواری بہ عورتی اتجمل بہ فی حیاتی

یعنی شکر اس ذات کا جس نے مجھے لباس دیا، جس کے ذریعے میں اپنے ستر کا پردہ کروں اور اس کے ذریعے زینت حاصل کروں (معارف القرآن)

نیا لباس بناتے وقت پرانے لباس کو صدقہ کر دینے کا ثواب عظیم

رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص نیا لباس پہننے کے بعد پرانے لباس کو غرباء و مساکین پر صدقہ کر دے تو وہ اپنی موت و حیات کے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری میں آ گیا۔

شریعت نے کوئی لباس مخصوص نہیں کیا

شریعت نے لباس کے بارے میں بڑی معتدل تعلیمات عطا فرمائی ہیں۔ چنانچہ شریعت نے کوئی خاص لباس مقرر کر کے اس کی ہیئت بتا کر یہ نہیں کہا کہ ہر آدمی کے لئے ایسا لباس پہننا ضروری ہے لہذا جو شخص اس ہیئت سے ہٹ کر لباس پہنے گا وہ اسلام کے خلاف ہے، ایسا اس لئے نہیں کیا گیا کہ اسلام دین فطرت ہے اور حالات کے لحاظ سے، مختلف ممالک کے لحاظ سے وہاں کے موسموں کے لحاظ سے

وہاں کی ضروریات کے لحاظ سے لباس مختلف ہو سکتا ہے۔ کہیں باریک، کہیں موٹا، کہیں کس وضع کا کہیں کس وضع کا، کہیں کس ہیئت کا لباس اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن اسلام نے لباس کے بارے میں کچھ بنیادی اصول عطا فرما دیئے۔ ان اصولوں کی ہر حالت میں رعایت رکھنی ضروری ہے، ان کو سمجھ لینا چاہیے۔

لباس کے چار بنیادی اصول

اے بنی آدم ہم نے تمہارے لئے ایسا لباس بنایا، جو تمہاری پوشیدہ اور شرم کی چیزوں کو چھپاتا ہے، جو تمہارے لئے زینت کا سبب بنتا ہے۔ اور تقویٰ کا لباس تمہارے لئے سب سے بہتر ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لباس کے چار اصول بتا دیئے ہیں۔ (اصلاحی خطبات)

لباس کا پہلا اور بنیادی اصول

لباس کا پہلا اصول یہ بیان فرمایا کہ وہ تمہاری پوشیدہ اور شرم کی چیزوں کو چھپا سکے۔ "سوءۃ" کے معنی وہ چیز جس کے ذکر کرنے سے یا جس کے ظاہر ہونے سے انسان شرم محسوس کرے، مراد "ستر عورت" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے جسم کے کچھ حصوں کو "عورت" قرار دیا یعنی وہ چھپانے کی چیز ہے ۔ وہ ستر عورت مردوں میں اور ہے، عورتوں میں اور ہے۔

مردوں میں ستر کو چھپانا ہر حال میں ضروری ہے وہ ناف سے لے گھٹنوں تک حصہ ہے۔ اس حصے کو کھولنا بلا ضرورت جائز نہیں، علاج وغیرہ کی مجبوری میں تو جائز ہے لیکن عام حالات میں اس کو چھپانا ضروری ہے۔ عورت کا سارا جسم سوائے چہرے اور گٹوں تک ہاتھ کے سب کا سب "عورت" اور "ستر" ہے جس کا چھپانا ضروری ہے اور کھولنا جائز نہیں۔

لہذا لباس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ شریعت کے مقرر کیے ہوئے ستر کے حصوں کو چھپا لے۔ جو لباس اس اصول کو پورا نہ کرے شریعت کی نگاہ میں لباس ہی نہیں، کیوں کہ وہ لباس اپنا بنیادی اصول پورا نہیں کر رہا جس کے لئے بنایا گیا ہے۔

لباس کے تین عیب

لباس کے بنیادی اصول کو پورا نہ کرنے کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔

ایک تو یہ ہے کہ لباس اتنا چھوٹا ہے کہ لباس پہننے کے باوجود ستر کا کچھ حصہ رہ گیا ہو، اس لباس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس لباس سے اس کا بنیادی مقصد حاصل نہ ہوا اور کشف عورت ہو گیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ لباس سے ستر کو چھپا تو لیا لیکن وہ اتنا باریک ہے کہ اس سے اندر کا بدن جھلکتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ لباس اتنا چست ہے کہ لباس پہننے کے باوجود جسم کی بناوٹ اور جسم کا ابھار نظر آ رہا ہے یہ بھی ستر کے خلاف ہے۔ مرد کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ایسے کپڑے سے چھپانا ضروری ہے جو اتنا موٹا ہو کہ اندر سے جسم نہ جھلکے اور وہ اتنا ڈھیلا ڈھالا ہو کہ اندر کے اعضاء کو نمایاں نہ کرے، اور اتنا مکمل ہو کہ جسم کا کوئی حصہ کھلا نہ رہ جائے اور یہی تین چیزیں عورت کے لباس میں بھی ضروری اور لازمی ہیں۔

لباس کا دوسرا اصول

اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ”ریشا“ یعنی ہم نے اس لباس کو تمہارے لئے زینت کی چیز اور خوبصورتی کی چیز بنائی۔ ایک انسان کی خوبصورتی لباس میں ہے لہٰذا ایسا ہونا چاہئے جسے دیکھ کر انسان کو فرحت ہو بدہیئت اور بے ڈھنگا نہ ہو جس کو دیکھ کر دوسروں کو نفرت اور کراہیت ہو بلکہ ایسا ہونا چاہئے جس کو دیکھ کر زینت کا فائدہ حاصل ہو سکے۔

لباس کے بارے میں تیسرا اصول

لباس کے بارے میں شریعت نے جو تیسرا اصول بیان فرمایا وہ ”تشبہ سے بچنا“ یعنی ایسا لباس پہننا جس کو پہن کر انسان کسی قوم کا فرد نظر آئے اور اس مقصد سے پہنے تاکہ میں ان جیسا ہو جاؤں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کسی غیر مسلم قوم کی نقالی کی نیت سے کوئی لباس پہننا قطع نظر کہ وہ چیز پسند ہے یا نہیں؟ لیکن چونکہ فلاں قوم کی نقالی کرنی ہے بس ان کی نقالی کے پیش نظر اس لباس کو اختیار کیا جا رہا ہے اس کو تشبہ کہا جاتا ہے اس نقالی پر حضور اقدس ﷺ نے بڑی وعید ارشاد فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: من تشبہ بقوم فہو منہم (ابوداؤد)

یعنی جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، اسی کی نقالی کرے اور ان جیسا بننے کی کوشش کرے تو وہ انہی میں سے ہے۔ گویا وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے اسی قوم کا ایک فرد ہے اس لئے کہ یہ شخص ان ہی کو پسند کررہا ہے۔ ان ہی سے محبت رکھتا ہے، ان ہی جیسا بننا چاہتا ہے تو اب اس کا حشر بھی ان ہی کے ساتھ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے۔ آمین۔

پتلون پہننا

آج کل مردوں میں کوٹ پتلون کا رواج چل پڑا ہے اس میں بعض باتیں تو فی نفسہ بھی ناجائز ہیں چاہے اس میں تشبہ پایا جائے یا نہ پایا جائے۔

چنانچہ ایک خرابی تو یہ ہے کہ یہ پتلون ٹخنوں سے نیچے پہنی جاتی ہے اور کوئی لباس بھی مردوں کے لیے ٹخنوں سے نیچے پہننا جائز نہیں۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر پتلون ایسی چست ہو کہ اس کی وجہ سے اعضاء نمایاں ہوں تو پھر لباس کا جو بنیادی مقصد تھا یعنی ستر کو حاصل کرنا وہ حاصل نہ ہوا تو پھر لباس شرعی لحاظ سے بے معنی اور بے کار ہے۔ لہٰذا ان دو خرابیوں کی وجہ سے فی نفسہ پتلون پہننا جائز نہیں لیکن اگر کوئی شخص اس بات کا اہتمام کرے کہ وہ پتلون چست نہ ہو بلکہ ڈھیلی ڈھالی ہو اور اس کا اہتمام کرے کہ وہ پتلون ٹخنوں سے نیچے نہ ہو تو ایسی پتلون پہننا فی نفسہ مباح ہے۔ (اصلاحی خطبات)

لباس کے بارے میں چوتھا اصول

لباس کے بارے میں چوتھا اصول یہ ہے کہ ایسا لباس پہننا حرام ہے جس پہن کر دل میں تکبر اور بڑائی پیدا ہو جائے، چاہے وہ لباس ٹاٹ کا ہی کیوں نہ ہو۔

مثلاً اگر ایک شخص ٹاٹ کا لباس پہنے اور مقصد یہ ہو کہ میں بڑا درویش اور صوفی نظر آؤں اور بڑا متقی اور پرہیز گار بن جاؤں اور پھر اس کی وجہ سے دوسروں میں اپنی بڑائی کا خیال دل میں آجائے اور دوسروں کی تحقیر پیدا ہو جائے تو ایسی صورت میں وہ ٹاٹ کا لباس بھی تکبر کا ذریعہ اور سبب ہے اس لیے اس کا پہننا حرام ہے۔

علم کی حقیقی طلب کے چار بنیادی امور

اخلاص وللہیت، مسلسل محنت، حسن اخلاق، ادب واحترام

حذیفہ وستانوی

اللہ کی صفات میں سے ایک صفت علم ہے۔ اللہ کی ذات ازلی تو اس کی صفت بھی ازلی اس کا کچھ حصہ اللہ نے مخلوق کو عطا کیا، اور اس میں انسان کو برتر رکھا، بلکہ بعض حضرات کی تحقیق کے بموجب صفت علم انسان کا خاصہ اور امتیاز ہے لہذا علم کو انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا، اور علم سے انسان کو متصف کرنے کی غرض عمدہ صفات، حسن اخلاق، اور سیرت اور کردار میں خوبی، اور بہتری پیدا کرنا ہے۔ اللہ رب العزت کی ذات، تمام صفات حمیدہ کو جامع ہے، اس لیے کہ اس کا علم "علم محیط" ہے۔ اللہ نے اپنی اس صفت کا پرتو انسان میں اسی لیے رکھا تا کہ تخلقوا باخلاق اللہ والی حدیث پر عمل درآمد ہوسکے، اور بندہ اپنے اندر بھی کمال پیدا کرے، حضرت آدم علیہ السلام کو جو برتری اور خصوصیت دی گئی اس کی وجہ بھی تو علم ہے لہذا علم کا تقاضہ یہ ہے کہ جتنا علم ہو انسان اتنا ہی با اخلاق ہو، حضرت انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو اللہ نے "علم وحی" سے نوازا تو ساری انسانیت کے لئے نمونہ ثابت ہوئے۔

حضرات صحابہ بھی جب علم الٰہی اور علم نبوی سے سرشار ہوئے تو انکی زندگیوں میں عجیب انقلاب برپا ہوگیا، اور وہ بھی رہتی دنیا تک انسانوں کے لیے اسوہ بن گئے معلوم ہوا علم دین اپنے اندر انقلابی تاثیر رکھتا مگر آج کل ہم دیکھ رہے ہیں ہمارے اہل علم حضرات بھی انتہائی نازک حالات کے شکار ہیں تو آئیے ہم کوشش کریں کہ اس بدترین صورت حال کے اسباب وعلل کیا ہیں؟

تعلیم کی موجودہ ابتر حالات کے ذمہ دار صرف کسی ایک طبقہ کو نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ امت کا اجتماعی وانفرادی طور پر ہر طبقہ اس کا ذمہ دار ہے، مگر زیادہ ذمہ دار طلبہ ہیں لہذا ہم چونکہ انہی سے مخاطب ہے اس لیے انہی کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہے گے۔

(۱) اخلاص وللہیت

آگے بڑھنے سے پہلے ہم چند سوالات جو ذہن میں گردش کرتے رہتے ہیں اس کی نشاندہی کرتے ہیں، سب سے پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انحطاط علمی کا سبب کیا ہے؟ پھر سوال پیدا ہوتا ہے

کہ طلبہ کیوں محنت نہیں کرتے؟ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کیوں زندگی میں علم پر عمل نہیں؟ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ طلبہ وعلماء کو کیوں آخرت کی فکر اور امت کا درد نہیں، اور کیا ان سوالات کے جوابات ممکن ہے تو آیئے ہم اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ہمیں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے یہ دنیا دار الاسباب ہے، اور اللہ کی ذات مسبب الاسباب ہے، لہٰذا ہمارا یہ کہنا کہ اب قیامت قریب آ گئی حالات ایسے بدل گئے ہے، اب محنت کر کر کوئی فائدہ نہیں اس بات کو ذہن سے نکال دینا چاہئے، اور اسباب کی طرف توجہ دینی چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''إن الله لا يضيع أجر المحسنين'' اللہ اخلاص کے ساتھ محنت کرنے والوں کی محنت ضائع نہیں کرتے۔ اب آپ ذرا غور کیجئے ''محسنین'' کا لفظ استعمال کیا، ''مجتہدین'' یا ''عاملین'' نہیں کہا، یا ''متحیرین'' یا ''ساعین'' یا ''شاغلین'' کا لفظ استعمال نہیں کیا، آخر کیوں ایسا، اس لیے کہ یہ تمام الفاظ کسی ایک حقیقت اور معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جبکہ ''احسان'' کا لفظ انتہائی معنی خیز اور جامع ومانع ہے، کیوں کہ احسان کے لغوی معنی تو خوب اچھا کرنا اور خوب اچھا کرنے کے لیے جہد وجہد، سعی عمل، شغل، سب ضروری ہے، اصطلاح شرع میں ''احسان'' کہتے ہے اخلاص اور للٰہیت کو، اب محسنین کا معنی ہوا خوب جد وجہد اور سعی پیہم کے ساتھ محض اللہ کے لیے کرنے والے۔

اب آیئے ہم اپنے طالب علمانہ کردار پر ایک نظر ڈالیں اور فیصلہ کریں، کہ کیا واقعتاً ہم محسنین میں ہیں؟ کیا ہم محنت اور جد وجہد اور سعی پیہم میں لگے ہوئے ہیں؟ کیا ہمارے اندر اخلاص و للٰہیت ہے؟ تو جواب نفی میں ہوگا اولاً تو اکثر وبیشتر طلبہ میں محنت اور لگن کا جذبہ نہیں، اور کچھ میں ہے تو عام طور پر محنت کے ساتھ جو مطلوبہ صفات ہے وہ نہیں یعنی اخلاص، تواضع، ادب، حسن اخلاق، معصیت سے دوری، وغیرہ۔

لہٰذا طلبہ عزیز سے لجاجت کے ساتھ گذارش ہے کہ اللہ کے واسطے سستی اور غفلت کو پس پشت ڈال کر خوب لگن اور محنت سے تحصیل علم میں لگ جائیں، تاکہ دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل ہوسکے، ساتھ تکبر سے حسد سے کذب بیانی سے سوء اخلاق سے بے ادبی سے چاہے کتاب کی ہو، چاہے استاذ کی ہو چاہے درس گاہ کی ہو، چاہے ادارہ کی اس سے مکمل اجتناب کریں۔

حاصل یہ کہ سب سے پہلے ضرورت ہے اخلاص اور للٰہیت کو پیدا کرنے کی ''إنما الأعمال

بالنیات "جب ہم یہ نیت کریں گے کہ اللہ کی رضا کے لیے علم حاصل کرنا ہے تو محنت کی توفیق کے راستے من جانب اللہ کھل جائیں گے، ہم آغاز سال میں یہ نیت کرلیں کہ "اللہ ہمارے یہاں آنے کا مقصد علم کو حاصل کرکے اس پر عمل کرنا اور تیری ذات قدس کو راضی کرنا ہے"۔

(۲) مسلسل محنت

عزیز طلبا! کیا آپ نے صحابہ کے حالات پڑھے اور سنے نہیں ان پر کوئی نگراں اور ذمہ دار نہیں مگر ان میں اخلاص تھا تو ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضر ہو کر علم حصول کی انہیں توفیق ہوتی تھی، کیا آپ نے اصحاب صفہ کے حالات نہیں پڑھے، بھوکے ہوتے کپڑے نہ ہوتے مگر برابر محنت میں لگے رہتے، حضرت ابوہریرہؓ بھی انہیں میں سے ایک تھے، اللہ نے انہیں کیا چمکایا، حضرات تابعین کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے اس زمانہ میں نہ کوئی درس گاہ ہوتی تھی نہ کوئی کمرہ نہ کوئی ہاسٹل اور رہائش گاہ نہ لائٹ نہ کھانے پینے کا انتظام، نہ کوئی زور زبردستی وہ تو اپنا سب کچھ لگا کر اخلاص کے ساتھ تن من دھن کی بازی لگا دیتے تھے، انہیں کے مجاہدات کی برکت سے آج علوم اسلامیہ صفحات کتب کی صورت میں موجود ہے، اگر وہ ہم لوگوں کی طرح راحت پسند اور عیش پرست ہوتے، یقیناً آج ہمارے پاس علمی ذخائر نہ ہوتے نہ کتابیں ہوتی اور نہ یہ مدارس ہوتے، دنیا کی تاریخ میں علماء اسلام نے جتنا لکھنے پڑھنے کا کام کیا، یقیناً کسی نے نہیں کیا، جیسا شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اس پر مستقل ایک تحریر کی ہے، "العلماء العزاب الذين آثروا العلم على الزواج" یعنی وہ علماء جو علم کے خاطر شادی سے کنارہ کش رہے، جن میں مشہور یہ ہیں:

ا رہناد بن سری کوفی محدث تھے، (۲) ابوجعفر محمد ابن جریر طبری مفسر محدث اور مورخ تھے بے شمار ضخیم کتابیں تصنیف فرمائی، (۳) ابوبکر ابن الانباری نحوی اور مفسر تھے، (۴) ابوعلی الفارسی جلیل القدر امام النحو تھے، (۵) ابوبکر الاندلسی محدث تھے، (۶) محمود ابن عمر زمخشری مفسر تھے، (۷) محی الدین زکریا النووی فقیہ محدث تھے مسلم شریف کے مشہور شارح اور بے شمار کتابوں کے مصنف تھے، (۸) ابوالحسن ابن النفیس دمشقی، (۹) ابن تیمیہ حرانی محدث فقیہ مفسر اور بے شمار کتابوں کے مصنف تھے، (۱۰) عز الدین محمد ابن جماعہ مصری فقیہ اور اصولی تھے، (۱۱) محمد ابن طولون مشہور مورخ گذرے ہیں، (۱۲) سلیمان ابن عمر الجمل جلالین کے مشہور شارح، (۱۳) ابوالمعالی محمود شکری الوسی بہت بڑے

ادیب تھے۔(۱۳) ابوالوفاء الافغانی ہندی فقیہ اور محدث تھے۔ وغیرہ بے شمار ایسے علماء گذرے ہیں اللہ امت مسلمہ کی جانب سے انہیں بہترین بدلہ عطا فرمائیں۔

ان لوگوں نے اپنا مال اپنا وقت اپنی خواہشات سب کچھ علم دین کے لیے قربان کر دیا، تو آج اللہ نے یہ مقام دنیا ہی میں عطا کیا صدیاں گذر جانے کے باوجود آج بھی جب ان کا تذکرہ ہوتا مسلم عقیدت سے رحمۃ اللہ علیہ کہتا؟

ہمارے متقدمین و متاخرین علماء نے اتنی جد وجہد اور محنت کی کہ شیخ عبد الفتاح ابوغدہ کو اپنی بے مثال تالیف "صفحات من صبر العلماء على شدائد العلم وتحصيله" کے مقدمہ میں لکھنا پڑا۔

"اگر تم ہمارے علماء کے احوال کا تتبع اور مطالعہ کروگے تو اندازہ ہوگا وہ کیا تھے؟ اور انہوں نے کیا کیا؟ وہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے محض علم کے خاطر لمبے لمبے اسفار کیے بھوک اور پیاس پر صبر کیا راتوں کو سونا چھوڑ دیا اپنے آپ کو خوب مشقت میں ڈالا یہاں تک کہ تاریخ ان کی قربانیوں کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے میں اپنی کتاب میں اس کا احاطہ اور استیعاب کرنا نہیں چاہتا ہوں، بلکہ نمونے کے طور مشت از خروارے کے ہر پہلو سے متعلق چند واقعات بیان کروں گا، کیوں کہ ان کی قربانیاں اتنی ہے کہ اس کو یکجا کرنا دشوار ہے، علم کے خاطر صبر آزمائی کے ایسے حیرت انگیز واقعات ہے کہ انسان کا ذہن اسے قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام واقعات سو فیصدی صحیح ہے، کیوں کہ سندوں کے ساتھ معتبر کتابوں میں منقول ہے، اگر آپ کو وہ سمجھ میں نہ آئے تو نہ آئے، بعض حیرت انگیز عجائبات میں آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں آپ کی عقل اس کو تسلیم کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوگی، مگر اتنی مستند اور صحیح روایات اور معتبر لوگوں سے مروی ہے کہ آپ کو صحیح ماننا ہی پڑے گا، مثلا محدث عظیم امام ابو داود سلیمان بن الاشعث السجستانی اپنی کتاب "سنن ابی داود" کے باب "صدقة الزرع" میں خود اپنا مشاہدہ نقل کرتے ہے کہ میں نے مصر کے سفر کے دوران ایک ککڑی دیکھی جس کی لمبائی تیرہ بالشت تھی، اور ایک اتنا بڑا نارنگی دیکھا کہ اس کو کاٹ کر اونٹ پر اس طور لادا گیا تھا ایک حصہ اونٹ کی کہان کی داہنی جانب اور دوسرا بائیں جانب کیا کوئی اس کی تصدیق کر سکتا ہے؟ مگر ایک ایسے محدث اس کو بیان فرما رہے ہیں جن کی صداقت پر امت کا اجماع ہے لہذا عجوبہ سمجھ کر ماننا پڑے گا۔

ایسا واقعہ محمد بن رافع نے ذکر کیا ہے جو امام بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابوزرعہ، تمام کبار محدثین کے استاذ اور شیخ ہیں کہ میں نے انگور کا ایک گچھا دیکھا جو ایک خچر کے برابر تھا۔

اسی طرح کے دسیوں عجائبات کو شیخ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں ذکر کیا اور پھر کہا کہ جس طرح ان واقعات کے حیرت انگیز ہونے کے باوجود آپ کو تسلیم کرنا پڑا کہ یہیں صحیح ہے، بس بالکل اسی طرح ہمارے اسلاف علم کے خاطر صبر آزمائی کے حیرت انگیز واقعات کو بھی آپ کو تسلیم کرنا ہوگا۔

طلب علم کے لیے اسلاف کی قربانیاں:

اسلام نے انسان کو پہلا درس ہی علم کا دیا، اللہ نے آدم علیہ السلام کو علم عطا کیا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی پہلی وحی علم سے متعلق نازل کی گئی، اس کا اثر یہ ہوا کہ اس امت کے افراد نے اپنے آپ کو علم کے لیے کھپادیا، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ فرماتے ہیں: ہمارے علماء اسلاف میں اکثر وبیشتر فقر وفاقہ کے شکار تھے، مگر ان کا فقر تحصیل علم کے لیے کبھی رکاوٹ نہ بنا، اور انہوں نے کبھی کسی کے سامنے اپنی محتاجی کو ظاہر بھی نہیں کیا۔

انہوں نے علم کی خاطر نہایت جاں گسل اور ہولناک مصائب وآلام جھیلے اور ایسے صبر وضبط کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کی طاقت اور برداشت کے سامنے خود "صبر" بے چین اور بے قرار ہوگیا۔

اسی کے ساتھ وہ اپنی دل کی گہرائیوں کے ساتھ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے اور حمد وثنا میں مصروف رہتے، ہر وقت شکر گذاری ان کا امتیازی وصف تھا، ان کی قربانیوں نے انہیں دنیا میں بھی سرخ رو کیا، اور قیامت تک آنے والے طالبان علوم کے لئے بہترین نمونہ بنادیا، سب کچھ انہوں نے صرف اور صرف کتاب وسنت کی خدمت اور اللہ کی رضاء کے لئے کیا۔

ان کی قربانیوں سے یہ بات عیاں ہوکر سامنے آتی ہے کہ اسلامی علوم کی تدوین وتالیف پر فضا وشاداب مقامات نہروں کے کناروں اور سایہ دار درختوں کے چھاؤں میں بیٹھ کر نہیں ہوئی، بلکہ یہ کام خون جگر کی قربانی دیکر ہوا ہے، اس کے لیے سخت گرمیوں میں پیاس کی ناقابل برداشت تکالیف اٹھانی پڑی، اور رات رات بھر ٹمٹماتے چراغ کے سامنے جاگنا پڑا، بلکہ طلب علم کی راہ میں جان عزیز کے قربان کو بھی انہوں کوئی بڑا کام تصور نہ کیا، آیئے اب میں انکی جد وجہد اور قربانیوں کے چند نمونے آپ کے سامنے پیش کررہا ہوں تاکہ ہمیں بھی ان کی راہ پر چلنے کا شوق پیدا ہو۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباس جو ترجمان القرآن کے نام سے جانے جاتے ہیں وہ ایسے ہی قرآن کے عظیم مفسر نہیں بن گئے بلکہ خوب محنت اور جدوجہد کی وہ خود فرماتے ہیں:

''حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ میں صحابہ کرام سے پوچھنے اور احادیث معلوم کرنے میں لگ گیا، مجھے (کبھی) پتہ لگتا کہ فلاں صحابی کے پاس حدیث موجود ہے تو میں ان کے مکان پر پہنچتا، وہاں آکر معلوم ہوتا کہ وہ آرام کر رہے ہیں، تو میں اپنی چادر ان کے دروازہ کے سامنے بچھا کر لیٹ جاتا، دوپہر کی گرمی میں ہوا چلتی تو تمام گرد وغبار میرے اوپر آتا۔

جب صاحب خانہ باہر آکر مجھے دیکھتے تو حیرت زدہ ہو کر استفسار کرتے عم زادۂ رسول! (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی) کیسے آنا ہوا؟ اور آپ نے یہ زحمت کیوں فرمائی، کسی کو بھیج کر مجھے کیوں نہ بلوا لیا؟ میں کہتا: نہیں جناب! مجھے ہی آنا چاہئے تھا، پھر میں ان سے حدیث معلوم کرتا۔ (صبر واستقامت، ص: ۵۰)

۲۔ عبدالرحمن بن قاسم جو امام مالک کے ممتاز شاگرد تھے وہ کیسے اتنے بڑے فقیہ اور محدث ہوئے۔

قاضی عیاض نے ''ترتیب المدارک'' میں عبدالرحمن بن قاسم عتقی (متوفی ۱۹۱ھ) کے حالات میں لکھا ہے (یاد رہے موصوف کا شمار امام مالکؒ اور لیثؒ وغیرہ کے مایہ ناز شاگردوں میں ہوتا ہے)۔

''ابن قاسم کہتے تھے: میں امام مالکؒ کے پاس، آخر شب کی تاریکی میں پہونچتا، اور کبھی دو، کبھی تین یا چار مسئلے دریافت کرتا اس وقت امام محترم کی طبیعت میں کافی انشراح محسوس ہوتا، ایک دفعہ ان کی چوکھٹ پر سر رکھے سو گیا، امام مالکؒ نماز کے لئے مسجد تشریف لے گئے، لیکن مجھے نیند کے غلبہ میں کچھ بھی پتہ نہ چل سکا، آنکھ اس وقت کھلی جب ان کی ایک کالی کلوٹی باندی نے میرے ٹھوکر مار کر یہ کہا: تیرے آقا چلے گئے، وہ تیری طرح غافل نہیں رہتے، آج ۴۹ سال ہونے کو آئے، انہوں نے فجر کی نماز کبھی کبھار کے علاوہ ہمیشہ عشاء ہی کے وضو سے پڑھی ہے۔ (اس کلوٹی نے آپ کو امام صاحب کے پاس اکثر آتے جاتے دیکھ کر ان کا غلام سمجھا)۔

امام مالک کے پاس ۱۷ سالہ قیام:

ابن قاسم کہتے ہیں: میں امام مالک کے پاس مسلسل سترہ سال رہا، لیکن اس مدت میں نہ کچھ بیچا اور نہ کچھ خریدا۔ (ذرا ہمارے وہ طلبہ غور کریں جو اکثر و بیشتر بازاروں کے چکر کاٹتے رہتے ہیں، کہ سترہ سال میں کبھی خرید و فروخت نہیں کیا)۔

باپ اور بیٹے کی ملاقات:

وہ کہتے ہیں: ایک روز میں آپ کے پاس بیٹھا تھا، اچانک ایک نقاب پوش نوجوان جو مصر سے حج کرنے کے لیے آیا تھا، مجلس میں پہونچا، اور امام مالک کو سلام کرکے پوچھا، کیا آپ یہاں ابن قاسم موجود ہیں؟ لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا، وہ آیا اور اس نے میری پیشانی کا بوسہ لیا، میں نے اس میں ایک نہایت عمدہ خوشبو محسوس کی، (جس کا بیان لفظوں میں کرنا مشکل ہے) در حقیقت وہ میرا بیٹا تھا، اور یہ خوشبو اسی سے آرہی تھی، میں جس وقت گھر سے چلا تو رحم مادر میں تھا، میں اس کی ماں سے جو میری بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ چچیری بہن بھی ہوتی تھی، یہ کہکر آیا تھا کہ لمبی مدت کے لیے جارہا ہوں واپسی کا کچھ پتہ نہیں کہ کب ہو، اس لیے تمہیں اختیار ہے چاہے میری ہی نکاح میں رہنا چاہے آزاد ہوکر دوسری جگہ چلی جا...... لیکن اس اللہ کی بندی نے آزاد ہونے کے بجائے میرے ہی نکاح میں رہنے کو اختیار کیا۔

(صبر واستقامت کے پیکر، ص:۱۵۱،۵۲)

۳۔ محمد بن طاہر مقدسی کے بارے میں آتا ہے کہ طلب حدیث کے خاطر سخت گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں لمبی لمبی مسافت طے کرنے کی وجہ سے بار ہا خون کا پیشاب ہوگیا۔ (وفیات الاعیان)

۴۔ ابونصر سجزی کا مخلصانہ طلب علم کا دور:

حافظ ذہبی "تذکرۃ الحفاظ" میں ابونصر سجزی کے بارے میں فرماتے ہیں "عبد اللہ بن سعید بن حاتم، ابونصر سجزی (متوفی ۴۴۴ھ) فن حدیث میں "حافظ" کے مرتبہ پر پہونچے ہوئے ہیں، (یہی نہیں بلکہ) آپ اپنے دور میں حدیث پاک کے سب سے بڑے حافظ، امام وقت اور مینارۂ سنت کی حیثیت رکھتے تھے، موصوف حدیث کی طلب میں زمین کے اس کنارہ سے اس کنارہ تک چکر لگا کرآئے ہیں"۔

ایک عورت کی پیشکش:

ابو اسحاق حبال کہتے ہیں: ''میں ایک روز ابو نصر سجزی کے پاس بیٹھا ہوا تھا، کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، میں نے اٹھکر اسے کھول دیا، اب میں نے دیکھا کہ ایک عورت مکان میں داخل ہوئی اور اس نے آکر ایک تھیلی نکالی جس میں ایک ہزار دینار تھے، اور اسے شیخ کے سامنے رکھ کر بولی: ''انہیں جس طرح آپ کا دل چاہے خرچ فرمائیں۔ شیخ نے پوچھا آخر مقصد کیا ہے، اس نے کہا ''میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے نکاح کرلیں، اگرچہ مجھے شادی بیاہ کی کوئی خواہش نہیں، لیکن اس طرح میں آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔

آپ نے کہا: ''تھیلی اٹھا کر یہاں سے چلی جاؤ'' .... جب وہ چلی گئی تو انھوں نے مجھ سے کہا: ''میں اپنے ملک سجستان سے صرف حصول علم کی نیت سے نکلا ہوں، اب اگر میں اس سفر میں شادی بیاہ کے جھمیلے میں پڑوں تو پھر میں ''طالب علم'' کہاں رہونگا....؟ اللہ نے طلب علم پر جو اجر وثواب رکھا ہے اس پر میں کسی بھی چیز کو ترجیح نہیں دینا چاہتا۔ (صبر واستقامت کے پیکر ص:۴۴)

۵۔ حافظ ابن مندہ اپنے وطن عزیز سے بیس سال کی عمر میں طلب علم کے لیے نکلے اور مسلسل ۴۵ سال تک سفر کرتے رہے، اور علم حاصل کرتے رہے ۶۵ سال کی عمر میں اپنے وطن واپس ہوئے، جب گھر سے نکلے تو چہرہ پر ایک بال نہ تھا، اور جب لوٹے تو داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے، مگر اتنے عرصے میں کتنا علم حاصل کیا، تو جعفر مستغفری فرماتے ہیں کہ میں نے حافظ ابو عبد محمد بن اسحٰق ابن مندہ سے، ایک مرتبہ پوچھا کہ آپ نے کتنا علم حاصل کیا، تو کہا پانچ ہزار من وزن کے برابر، اللہ اکبر۔ (تذکرۃ الحفاظ)۔

امام شعبی عامر بن شراحیل کوفی ہمدانی بڑے پائے کے محدث گذرے ہیں ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو اتنا سب علم کیسے حاصل، تو فرمایا چار باتوں کا التزام کی وجہ سے (۱) کبھی کسی کتاب یا کاپی کے بھروسہ پر نہ رہا یعنی جو سنا سب یاد کر لیا۔ (۲) طلب علم کے لئے دربدر سفر کرتا رہا۔ (۳) جمادات کی طرح صبر کرتا رہا یعنی جمادات کو پانی دو یا نہ دو کھا دو یا نہ دو خاموش رہتا ہے، میں بھی بھوک اور پیاس پر صبر کرتا رہا۔ (۴) کوے کی مانند صبح سویرے اٹھتا رہا یعنی بہت کم سوتا رہا تب جا کر اتنا علم حاصل ہوا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

(۳) بلند ہمتی

میرے عزیز طالب علم ساتھیوں: یہ تھا ہمارے اسلاف کا بے مثال مجاہدہ معلوم ہوا علم دین کے حصول کے لیے مسلسل جد وجہد اور محنت اور بلند ہمتی ضروری ہے۔ علامہ زرنوجی فرماتے ہیں کہ اگر "محنت خوب" ہو اور "بلند ہمتی" نہ ہو تو بھی علم زیادہ حاصل نہیں ہوتا، اور "ہمت" تو ہو مگر "محنت" نہ ہو تو بھی علم حاصل نہیں ہوتا۔ آج ہمارے طلبہ میں یہی بیماری کسی میں "محنت" کا جذبہ نہیں اور اگر "محنت" کا جذبہ ہے تو "بلند ہمتی" نہیں، یعنی کسی بھی کتاب کو جب کچھ محنت کے بعد سمجھ میں نہ آئے تو مشکل سمجھ کر نا امید ہو جاتے ہیں، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ جیسا کہ ابھی آپ نے ہمارے اسلاف کی محنت اور جد وجہد پر چند حیرت کن حالات پڑھے، ان کی بلند ہمت کے بھی دو تین نمونے پیش خدمت ہے۔

امام ابن القیم فرماتے ہیں: کہ مجھے تعجب ہے طلبہ پر اس لیے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ہر قیمتی چیز کو حاصل کرنے کے لیے بلند ہمتی جد وجہد درکار ہوتی ہے بلکہ علم کے بارے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایسے ہی حاصل ہو جائے، تو یہ کیسے ممکن ہے جبکہ علم دین تو دنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ قیمتی ہے، تو ذرا غور کیجئے اس کے لیے کتنی ہمت اور محنت درکار ہوگی۔ مسلسل محنت، تکرار راحتوں اور لذتوں کو چھوڑنے سے علم حاصل ہوتا ہے۔

ایک فقیہ فرماتے ہیں: میں ایک مدت تک ہریسہ (عربوں کا ایک لذیذ کھانا) کھانے کی تمنا کرتا رہا مگر کبھی نہ کھا سکا، اس لیے کہ ہریسہ اس وقت بازار میں فروخت ہوتا تھا جب درس کا وقت ہوتا تھا، میں نے کبھی بھی درس چھوڑنے کو پسند نہیں کیا۔

ابن کثیر فرماتے ہیں جسم کی راحت کے ساتھ علم حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔

امام مزنی فرماتے ہیں کہ کسی نے امام شافعی سے دریافت کیا، آپ کے حصول علم خواہش کیسی ہے؟ تو فرمایا جب میں کوئی نیا علمی نکتہ یا نئی علمی بات سنتا ہوں تو مجھے اتنی خوشی ہوتی اور لذت ہوتی ہے کہ میرے خواہش ہوتی ہے کہ میرے بدن کے ہر عضو کو قوت سماعت ہو اور وہ بھی لذت محسوس کرے۔

پھر کسی نے پوچھا آپ علم پر کتنی حرص رکھتے ہیں جس قدر ایک مال و دولت کو جمع کرنے والا مال کو حاصل کرنے کی حرص رکھتا ہے۔

پھر پوچھا کہ آپ کے علم کی طلب کی کیفیت کیا ہے تو کہا جیسے اس ماں کی جو اپنے گمشدہ بچے کی تلاش میں ہوتی ہے اور اسے اس کے علاوہ کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی۔

امام ثعلبہ فرماتے ہیں کہ میں علم کے خاطر ابراہیم حربی کے پاس پچاس سال مسلسل قیام کیے رہا۔

امام نحو خلیل فراہیدی فرماتے ہیں کہ مجھے سب سے زیادہ شاق وہ وقت لگتا ہے جب میں کھانا کھاتا ہوں کیوں کہ اس وقت کوئی علمی فائدہ نہیں ہوتا۔

عمار ابن رجا فرماتے ہیں کہ تیس سال تک میں اپنے ہاتھ سے کھانا نہ کھا سکا میں حدیث لکھتا تھا اور میری بہن میرے منہ میں لقمے دیتی تھی۔

بقی ابن مخلد کا حیرت انگیز واقعہ:

یہ واقعہ ایک ایسے علم کے شیدائی کا ہے جس نے مغرب بعید سے مشرق تک کئی ہزار میل کا پیدل سفر محض اس لئے طے کیا کہ وہاں کے مسلمانوں کے ایک زبردست امام اور عالم جلیل کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے دامن کو "علم حدیث" کی دولت سے بھرے لیکن جب وہ علم کا جویا وہاں پہونچا تو معلوم ہوا کہ جس کی خاطر اس نے یہ طویل و عریض سفر پیدل چل کر کیا ہے، وہ ایک سخت آزمائش میں مبتلا ہے، اور درس و تدریس اور لوگوں سے ملنے جلنے پر حکومت کی جانب سے کڑی پابندی عائد ہے مگر وہ بھی علم کا متوالا اور طالب حقیقی تھا، اس نے حصول علم کے لئے ایک ایسی راہ اختیار کی جس کا تصور بھی ہر کس و ناکس کے لیے مشکل۔

بقی بن مخلد کا پیادہ پا سفر بغداد: علمی دنیا کی ناقابل قدر تصنیف "منہج احمد فی تراجم اصحاب امام احمد" میں امام بقی بن مخلد اندلسی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"حافظ حدیث ابو عبد الرحمن بقی بن مخلد اندلسی ۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے، آپ نے اندلس سے بغداد تک سفر پیدل چل کر طے کیا، مقصد امام احمد بن حنبل کی خدمت میں حاضر ہو کر علم حدیث حاصل کرنا تھا۔

وحشت ناک خبر: خود موصوف سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"جب میں بغداد کے قریب پہونچا اس آزمائش اور امتحان کی خبر ملی جس سے ان دنوں امام احمد بن حنبل دوچار تھے، یہ بھی معلوم ہوا کہ ان سے ملنے اور حدیث سننے کی سرکاری طور پر پابندی ہے، یہ سنتا

تھا کہ رنج وملال کا پہاڑ میرے اوپر ٹوٹ پڑا، میں وہیں رک گیا، اور سامان ایک سرائے کے کمرے میں رکھ کر بغداد کی عظیم الشان جامع مسجد پہونچا، میں چاہتا تھا کہ لوگوں کے پاس جاکر دیکھوں کہ وہ آپس میں امام موصوف کے بارے میں کیا کیا تبصرے کررہے ہیں؟ اور ان میں کیا کیا چہ میگوئیاں ہورہی ہیں؟؟۔

ایک مہذب حلقہ: اتفاق سے وہاں بہت ہی عمدہ اور مہذب حلقہ لگا ہوا تھا، اور ایک شخص راویان حدیث کے حالات بیان کررہا تھا، وہ بعض کو ضعیف اور بعض کو قوی قرار دیتا، میں نے اپنے پاس والے آدمی سے پوچھا: یہ کون صاحب ہیں؟ اس نے کہا: یحیٰ بن معین! مجھے آپ کے قریب تھوڑی سی خالی جگہ نظر آئی، میں وہاں جاکر کھڑا ہوگیا اور عرض کیا: شیخ ابوزکریا! میں ایک پردیسی آدمی ہوں جس کا وطن یہاں سے بہت دور ہے، میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، آپ میری خستہ حالی کی بنا پر مجھے جواب سے محروم نہ فرمائیں انہوں نے کہا: پوچھو کیا پوچھنا ہے؟

چند سوالات: میں نے چند ایسے محدثین کے بارے میں دریافت کیا جن سے میری ملاقات ہو چکی تھی، انہوں نے بعض کو صحیح اور بعض کو مجروح بتایا، آخر میں ہشام بن عمار کے متعلق پوچھا موصوف کے پاس میری حاضری بارہا ہوئی ہے، اور ان سے حدیث کا ایک بڑا حصہ حاصل کیا ہے، آپ نے موصوف کا نام سن کر فرمایا: ابو الولید ہشام بن عمار، دمشق کے رہنے والے، بہت بڑے نمازی، ثقہ بلکہ اس سے بڑھ کر ہیں

میرا اتنا پوچھنا تھا کہ حلقہ والے چیخ پڑے "جناب بس کیجئے دوسروں کو بھی پوچھنا ہے" میں نے کھڑے کھڑے عرض کیا "میں آپ سے احمد بن حنبل کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں "یہ سن کر یحیٰ بن معین نے بڑے حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا: ہم جیسے احمد ابن حنبل کے بارے میں تنقید کریں گے؟ وہ مسلمانوں کے امام، ان کے مسلمہ عالم اور صاحب فضل وکمال، نیز ان میں سب سے بہتر شخص ہیں"۔

امام احمد بن حنبلؒ کے مکان پر: اس کے بعد میں وہاں سے چلا آیا، اور پوچھتے پوچھتے امام احمد

بن حنبل کے مکان پر پہونچ گیا، میں نے دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹائی، آپ تشریف لائے اور دروازہ کھول دیا، انہوں نے مجھ پر نظر ڈالی، ظاہر ہے میں ان کے لئے ایک اجنبی تھا، اس لئے میں نے کہا: حضرت والا! میں ایک پردیسی آدمی ہوں، اس شہر میں پہلی بار آنا ہوا ہے طالب حدیث ہوں، اور یہ سفر محض آپ کی خدمت میں حاضری کی وجہ سے ہوا ہے!! انہوں نے فرمایا: ''اندر آجاؤ، کہیں تمہیں کوئی دیکھ نہ لے''۔

سوال و جواب: جب میں اندر آگیا تو انہوں نے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے کہا مغرب بعید!! انہوں نے کہا: افریقہ؟ میں نے کہا: اس سے بھی دور، مجھے اپنے ملک سے افریقہ تک جانے کے لیے سمندر پار کرنا پڑتا ہے..... میں اندلس کا رہنے والا ہوں!! انہوں نے کہا: واقعی تمہارا وطن بہت دور ہے، تمہارے جیسے شخص کے مقصد کو پورا کرنا اور اس پر ہر ممکن تعاون کرنا مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، لیکن کیا کروں، اس وقت آزمائش میں گرفتار ہوں، شاید تمہیں اس کے بارے میں معلوم ہو گیا ہو!! اس نے کہا جی ہاں، مجھے اس واقعہ کی اطلاع راستہ میں شہر کے قریب پہونچنے پر ہوئی۔

میں بھیکاری بن کر آجایا کروں گا!: میں نے عرض کیا: ابو عبد اللہ! میں پہلی بار اس شہر میں آیا ہوں، مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا، اگر آپ اجازت دیں تو میں روزانہ آپ کے پاس فقیر کے بھیس میں آجایا کروں گا، اور دروازے پر ویسی ہی صدا لگایا کروں گا جیسی وہ لگاتے ہیں، آپ یہاں تشریف لے آیا کریں، اگر آپ نے روزانہ ایک حدیث بھی سنادی تو وہ میرے لیے کافی ہے، آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ تم لوگوں پاس آمد و رفت نہیں رکھو گے، اور نہ محدثین کے حلقوں میں جاؤ گے، میں نے کہا: آپ کی شرط منظور ہے۔

میرا معمول: الغرض میں روزانہ اپنے ہاتھ میں ایک لکڑی لیتا، سر پر بھیکاریوں کا سا کپڑا باندھتا، اور کاغذ دوات، آستین کے اندر رکھ کر آپ کے دروازے پر جا کر صدا دیتا ''خدا بہت سارے بابا!!!'' وہاں مانگنے کے یہی دستور تھا..... آپ تشریف لاتے اور جب میں اندر ہو جاتا دروازہ بند کر کے کبھی دو، کبھی تین یا اس سے زیادہ حدیثیں بیان فرماتے۔

(صبر واستقامت کے پیکر ص: ۱۸۱ تا ۱۸۵)

طلبہ عزیز! ذرا دیکھو تو سہی کہ ابن مخلد کی بلند حوصلگی اور علو ہمت کو، کہ ہزاروں میل کا پیادہ سفر کیا اور بھیکاری کے بھیس میں ۱۳ سال تک حدیث حاصل کی اسی بلند ہمتی نے انہیں ہمیشہ ہمیش کے لیے ذکر خیر سے یاد کرنے کے لیے بعد والوں کو مجبور کر دیا ہے، اللہ تو ہمارے اسلاف کو امت کی جانب سے بہتر بدلہ اور صلہ عطا فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۴) ادب

مسلسل محنت کے ساتھ بلند ہمتی اور اس کے ساتھ استاذ، کتاب، اور آلات علم کا ادب بھی انتہائی ضروری ہے جیسا کہ امام طبرانی نے روایت نقل کی، "وتواضعو لمن تعلمون منه"۔

"جس سے علم سیکھو اس کے ساتھ ادب اور تواضع سے پیش آوے"۔

حضرت تھانوی فرماتے ہیں جس قدر استاذ سے محبت ہوگی اور جتنا استاذ کا ادب واحترام ہوگا اس قدر علم میں برکت ہوگی، عادۃ اللہ کے استاذ راضی نہ ہو تو علم نہیں آسکتا۔

(اصلاح انقلاب امت)

حضرت تھانوی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ استاذ کا ادب تقوی میں داخل ہے، جو اس میں کوتاہی کرے گا، وہ متقی نہیں ہوگا، حالاں کہ تقوی کی زیادتی علم میں زیادتی کا سبب ہے۔

(التبلیغ)

اساتذہ کرام کے آداب: طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ اپنے استاذوں کا غایت احترام کرے مغیرہ کہتے ہیں کہ ہم استاذ سے ایسا ڈرتے تھے جیسے لوگ بادشاہ سے ڈرا کرتے ہیں، حدیث پاک میں بھی یہ حکم ہے کہ جن سے علم حاصل کرو ان سے تواضع سے پیش آؤ۔

(۲) اپنے شیخ کو سب سے فائق سمجھے: حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مقولہ ہے کہ جو اپنے استاذ کا حق نہیں سمجھتا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

(۳) استاذ کی رضا کا ہر وقت خیال رکھے، اس کی ناراضگی سے پرہیز کرے، اتنی دیر اس

کے پاس بیٹھے بھی نہیں، جس سے اس کو گراں ہو۔

(۴) استاذ سے اپنے مشاغل میں اور جو پڑھتا ہے اس کے بارے میں خاص طور سے مشورہ کرتا رہے۔

(۵) اس سے نہایت احتراز کرنا چاہئے کہ شرم اور کبر کی وجہ سے اپنے ہم عمر یا اپنے سے عمر میں چھوٹے سے علم حاصل کرنے میں پس وپیش کرے۔ حضرت اصمعی کہتے ہیں کہ جو علم حاصل کرنے کی ذلت نہیں برداشت کرے گا وہ عمر بھر جہل کی ذلت برداشت کرے گا۔

(۶) یہ بھی ضروری ہے کہ استاذ کی تنگی کو تحمل برداشت کرے (یہ نہایت اختصار سے مقدمہ ''اوجز المسالک'' سے چند اصول نقل کیے گئے ہیں)۔

(۷) اور یہ تو نہایت مشہور مقولہ اور نہایت مجرب ہے کہ استاذ کی بے حرمتی سے علم کی برکات سے ہمیشہ محروم رہتا ہے... الخ۔ (آپ بیتی: ۲/۲۶)

(۸) اور عادت اللہ ہمیشہ یہی جاری ہے کہ اساتذہ کا احترام نہ کرنے والا کبھی بھی علم سے منتفع نہیں ہوسکتا۔ جہاں کہیں اہل فن طالب علم کے اصول لکھتے ہیں اس چیز کو نہایت اہتمام سے ذکر فرماتے ہیں۔ اور محدثین نے تو مستقل طور پر آداب طالب کا باب ذکر کیا ہے جو ''اوجز المسالک'' کے مقدمہ میں مفصل مذکور ہے اس میں اس چیز کو خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے بھی ''احیاء العلوم'' میں اس پر مفصل بحث فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ استاذ کے ہاتھ میں بالکلیہ اپنی باگ دے دیں۔ اور بالکل اسی طرح اختیار کرے جیسا کہ بیمار مشفق طبیب کے سامنے ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد کہ جس نے مجھے ایک حرف بھی پڑھا دیا میں اس کا غلام ہوں چاہے وہ مجھے فروخت کردے یا غلام بنادے۔ (ص ۲۰)

(۹) میرا تو تجربہ یہاں تک ہے کہ انگریزی طلبہ میں بھی جو لوگ طالب علمی میں اساتذہ کی مار کھاتے ہیں وہ کافی ترقیاں حاصل کرتے ہیں۔ اونچے اونچے عہدوں پر پہنچتے ہیں، جس کی غرض سے وہ علم حاصل کیا تھا وہ نفع پورے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اور جو اس زمانہ میں استاذوں کے ساتھ نخوت

بیکار سے رہتے ہیں، وہ بعد میں ڈگریاں لئے ہوئے سفارشیں کراتے ہیں، کہیں اگر ملازمت مل بھی جاتی ہے تو آئے دن اس پر آفات ہی رہتی ہیں، بہر حال جو علم ہو اس کا کمال اس وقت تک ہوتا ہی نہیں اور اس کا نفع حاصل ہی نہیں ہوتا جب تک کہ اس فن کے اساتذہ کا ادب نہ کرے، چہ جائے کہ ان سے مخالفت کرے۔ (ص:۶۱)

(۱۰) کتاب ''ادب الدنیا والدین'' میں لکھا ہے کہ طالب علم کے لیے استاذ کی خوشامد اور اس کے سامنے تذلل (ذلیل بننا) ضروری ہے، اگر ان دونوں چیزوں کو اختیار کرے گا تو نفع کمائے گا اور دونوں کو چھوڑ دے گا تو محروم رہے گا۔

ارشاد فرمایا: ''قوت حافظہ کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں، ان میں اہم سبب اپنے اساتذہ کے لیے دعا کرنا بھی ہے جتنا بھی اس کا اہتمام کیا جائے گا قوت حافظہ میں اسی قدر اضافہ ہوتا رہے گا۔ (ص:۶۶)

دارالعلوم کے ایک فاضل مہمان نے زیادہ حافظہ کے وظیفہ کی درخواست کی تو ارشاد فرمایا:

''آپ حضرات کو جو اپنی مادر علمی اور اساتذہ سے گہرا ربط اور تعلق ہے یہ بھی قوت حافظہ کے اسباب سے ایک ہے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو جو تبحر علمی اللہ پاک نے عنایت فرمایا تھا اس کے یقینا بہت سے وجوہ ہوں گے، ان میں ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے تمام زندگی اپنے استاذ کے گھر کی طرف پاؤں نہیں پھیلائے، اور نہ ادھر پاؤں کرکے سوئے، آج جو شیخ مدنی رحمہ اللہ کا جگہ جگہ ذکر خیر ہے اور ان کے علوم وفیوضات کا سلسلہ روز افزوں ہے اور اب جو ایک صاحب نے بتایا ہے کہ کوئٹہ انوالہ میں ''الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر'' دوبارہ شائع کیا جارہا ہے اس کی وجہ بھی ہے کہ شیخ مدنی رحمہ اللہ نے اپنے استاذ شیخ الہند رحمہ اللہ کی خدمت کی، مالٹا جیل میں گئے اور ساتھ رہے اور کسی ممکن خدمت سے دریغ نہیں کیا۔ (ص:۸۱)

ارشاد فرمایا: ''جب تحصیل علم کے تین آداب کو ملحوظ رکھا جائے تب صلاحیت نکھرتی، استعداد جلا پاتی، اور علمی وروحانی ترقیاں حاصل ہوتی ہیں۔ (۱) استاذ کا ادب (۲) مسجد اور درس گاہ کا ادب (۳) کتاب کا ادب''۔ (ص:۱۲۱)

ارشاد فرمایا: ادب قلبی کیفیت اور باطنی محبت کا مظہر ہوتا ہے اس لیے تحصیل علم کے دوران طالب علم کو چاہیے کہ اپنے استاذ کی محبت کو دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جگہ دے، اور اس کا دل و جان سے عاشق بن جائے، یا اعمال اور خلوص و محبت کا ایسا مظاہرہ کرے کہ استاذ کے دل میں جگہ پالے اور استاذ کا محبوب بن جائے۔

مگر پہلی صورت کہ اپنے استاذ سے عشق و محبت اور وارفتگی میں دیوانگی و جنون کی حد تک پہنچ جائے، دوسری صورت کی نسبت بے حد نافع اور مفید ہے، ایسے طالب علم بھی حاصل کر لیتے ہیں اور ان کا فیض بھی زیادہ پھیلتا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ: ''والدین کی خدمت سے عمر میں برکت ہوتی ہے اور اساتذہ کی خدمت سے علم میں برکت ہوتی ہے، مقصد یہ ہے کہ ان خدمات کے یہ خاصیتی اثرات ہیں جو ان پر مرتب ہوتے ہیں، چینی کی اپنی لذت ہے، گڑ کا اپنا ذائقہ ہے، مٹھائی کی اپنی چاشنی ہے جو چیز کھائی جائے گی اس کی ذاتی خاصیت کی بنا پر اس کے اثرات ثمرات اور نتائج مرتب ہوں گے، تو والدین کی خدمت سے زیادہ عمر اور اساتذہ کی خدمت سے زیادہ علم اور خدمت علم کے اثرات اور نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ (ص:۲۵۹)

استاذ کی روک ٹوک اگر برے بھی ہو تو اس کو برا نہ سمجھے اور نہ چہرے پر شکن پڑے نہ ملال ظاہر کرے، اس لیے کہ اس سے استاذ کے دل میں انقباض پیدا ہو جائے گا، اور دروازہ نفع کا بند ہو جائے گا، کیونکہ یہ موقوف ہے انشراح دل اور مناسبت پر، اور صورت مذکورہ میں دونوں باتیں نہیں ہیں، بہت بڑا فائدہ اور جلد منفعت کی کنجی یہ ہے کہ جس سے نفع حاصل کرنا ہو خواہ خالق سے یا مخلوق سے، اس کے سامنے اپنے کو مٹا دے اور فنا کر دے، اپنی رائے و تدبیر کو بالکل دخل نہ دے، پھر دیکھئے کیسا نفع حاصل ہوتا ہے، اور یہ بڑا کمال ہے۔

تو درو گم شو وصال این ست و بس ۔۔۔ تو مباش اصلا کمال این ست و بس

اگر کسی مسئلہ میں استاذ کی تقریر ذہن میں نہ بیٹھے، تو کچھ دیر تک استفادہ کی لہجہ میں خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی تقریر کرے، اگر پھر بھی سمجھ میں نہ آوے تو خاموش ہو جائے، اور دل میں یہ رکھ لے کہ اس کی تحقیق کروں گا، بعد میں کتابوں سے اور علماء سے تحقیق کرے، اور اگر اپنی رائے صحیح ہو اور

استاذ حق پسند ہو تو اس کتاب اور بڑے عالم کی تحقیق کو ان کے سامنے پیش کردے، اگر استاذ کی تقریر صحیح ہو تو معذرت کر دے کہ آپ صحیح فرماتے تھے میں غلطی پر تھا۔

استاذ کے مقابلہ میں مکابرہ، مناظرہ، مجادلہ کی صورت ہرگز نہ بنائے، یعنی آنکھیں نہ چڑھیں، گفتگو میں تیزی نہ ہو پیشانی پر بل نہ ہو بڑوں کے مقابلہ میں یہ بے ادبی ہے۔

(ص:۴۷-۴۸)

طالب علم سے اگر استاذ کی بے ادبی یا نافرمانی یا ایذا رسانی ہو جائے تو فوراً نہایت نیاز و عجز سے معافی چاہے اور الفاظ معافی کے ساتھ اعضاء سے بھی عاجزی و انکساری ندامت ٹپکے، یہ نہیں کہ لٹھ مار دیا کہ اجی معاف کردو۔

اگر دل میں ندامت ہوگی تو اعضاء سے بھی ندامت ٹپکے گی، اگر یہ بھی نہ ہو تو بناوٹ ہی کرے، اصل نہیں تو نقل ہی سہی مگر تاخیر نہ کرے، کیونکہ اگر استاذ دنیادار ہوگا تو تاخیر کرنے سے اس کی کدورت بڑھ جائے گی اور تمہارا نقصان ہوگا، اور اگر دیندار ہوگا تو گو وہ کدورت وغیرہ شرافات کو اپنے دل میں جگہ نہ دے گا، کیونکہ اس کا مشرب یہ ہوتا ہے۔

آئین ما ست سینہ چو آئینہ داشتن — بہ نشین در دل ویرانہ ام اے گنج مراد
کفرست در طریقت ما کینہ داشتن — کہ من ایں خانہ ویراں کردم

مگر رنج طبعی ہوگا اور یہ بھی طالب علم کے لیے مضر ہوگا کیونکہ اس حالت میں انشراح قلب نہ رہے گا اور بغیر انشراح قلب نفع نہ ہوگا، اور تاخیر کرنے میں یہ بھی خرابی ہے کہ جتنی تاخیر ہوگی اتنا ہی حجاب بڑھتا جائے گا۔ (ص:۵۱-۵۲)

حضرت اقدس مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(۱) علمی استعداد سات چیزوں پر موقوف ہے: (۱) ذہن (۲) حافظہ (۳) محنت (۴) آلات علم یعنی کتاب، کاغذ، قلم اور تپائی وغیرہ کا ادب (۵) استاذ کا ادب (۶) دعاء (۷) ترک منکرات۔

ان میں سب سے زیادہ اہم چیز ترک منکرات ہے، اس لیے کہ علم دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص عنایت اور اس کی بہت بڑی نعمت ہے، وہ اتنی بڑی دولت صرف اسی کو عطا فرماتے ہیں جو

اس کی ہر نافرمانی کو چھوڑ کر اس سے محبت کا ثبوت پیش کرے۔ (جواہر الرشید، ۱/۱۱۴)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا ادب واحترام:

حضرت والا کو اپنے اساتذہ سے اتنا شدید تعلق تھا کہ دوسرے کو نہ تھا، بس یوں کہا جائے کہ عشق تھا، چنانچہ فرمایا کرتے ہیں کہ میں نے پڑھنے میں کبھی محنت نہیں کی جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا اساتذہ اور بزرگوں کے ساتھ ادب ومحبت کا تعلق رکھنے کی بدولت عطا فرمایا، اور الحمد للہ! میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی بزرگ کو ایک منٹ کے لیے بھی ناراض نہیں کیا اور جتنا میرے قلب میں بزرگان دین کا ادب ہے آج کل شاید ہی کسی کے دل میں اتنا ہو۔

شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ

حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں متعدد حضرات نے بیان کیا کہ کوئی بات دریافت کرنی ہوتی یا کتاب کا مضمون سمجھنا ہوتا تو اپنے استاذ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے مکان کے دروازہ پر جا کر بیٹھ جاتے، جب حضرت گھر سے باہر نکلتے اس وقت دریافت کرتے اور تقریباً روزانہ ہی کا معمول تھا۔ (آداب المتعلمین، ص ۴۷)

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب رحمہ اللہ

مولانا گیلانی اپنے اساتذہ کا بڑا احترام فرماتے تھے، اور سخت سے سخت وقت پر بھی ان کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کرتے، اور نہ بہانے تلاش کرتے تھے بلکہ فوراً تعمیل حکم کے لیے حاضر ہو جاتے۔

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا، اور اس کے صدقہ میں ایک نئی مسلم مملکت وجود میں آئی جو پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے چاہا کہ یہاں اسلامی دستور نافذ ہو، اس اسلامی دستور کو مرتب کرنے کے لیے بہت سے علماء کو مولانا عثمانی نے کراچی میں جمع کرنے کی سعی فرمائی، ان میں حضرت مولانا گیلانی رحمہ اللہ کا بھی نام تھا، اس وقت حالات سازگار نہ تھے، مگر استاذ محترم کے حکم کے خلاف کسی بہانہ کی جرأت نہیں فرمائی بلکہ فوراً تشریف لے گئے۔

مولانا نے خود اپنے ایک خط میں جو علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام ہے لکھتے ہیں:

''آپ کے ارادہ عدم شرکت سے مطلع ہونے کے بعد خاکسار نے بھی قطعی فیصلہ کراچی نہ جانے کا کر لیا تھا، لیکن مولانا عثمانی کی طرف سے تار اور خطوط کے تسلسل نے فسخ عزم کو اور خیال کیا ان سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہوئے دل نے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی۔

(حیات گیلانی، ص:۲۹۴)

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ کا واقعہ

(۱) دنیا کا تجربہ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ محض کتابوں کے پڑھ لینے سے کسی کو علم کے حقیقی ثمرات اور کمالات حاصل نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے ''نوش مرد کا ملے پامال شو'' پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے، نیز استاذ کا ادب واحترام ہمہ وقت ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ بے ادبی فیوضات کے حصول کی راہ میں سنگ گراں بن جاتی ہے۔ حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی دل میں اساتذہ کا ادب واحترام اور خدمت کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا تھا، اور ان کی خدمت باعث صد افتخار سمجھتے تھے، اگرچہ ان کے ہم سبق طلبہ اس سعادت کو نظر حقارت دیکھتے تھے، جیسا کہ حضرت الشیخ رحمہ اللہ خود بیان فرماتے ہیں:

''میں خود دیوبند میں تھا تو زمانہ طالب علمی میں حضرت شیخ مدنی رحمہ اللہ کے ہاں بعض اوقات ان کی خدمت کے لیے جایا کرتا اور پاؤں دباتا، اور بعض ساتھی ہنستے کہ یہ چاپلوسی کرتا ہے، مگر یہ ان بزرگوں کی توجہ کا نتیجہ ہے کہ مجھ نالائق انسان سے بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ دین کا کام لیا اور مزید توفیق دے رہے ہیں، ان میں سے کئی اور ساتھی ہیں جو اس راستہ کو چھوڑ چکے ہیں تو علم سارا ادب ہی ادب ہے، دین کا ادب، اساتذہ کا ادب اور علم کا ادب۔''

(ماہنامہ ''الحق'' حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق نمبر، ص:۳۳۲)

آلات علم کاغذ، قلم، روشنائی کا ادب اور مجدد الف ثانیؒ کا حال:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایک روز بیت الخلاء میں تشریف لے گئے، اندر جا کر نظر پڑی کہ انگوٹھے کے ناخن پر ایک نقطہ روشنائی کا لگا ہوا ہے جو عموماً لکھتے وقت قلم کی روانی دیکھنے کے لیے

لگایا جاتا ہے، فوراً گھبرا کر باہر آگئے اور دھونے کے بعد تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ان نقطوں کو علم کے ساتھ ایک تلبس ونسبت ہے۔ اس لئے بے ادبی معلوم ہوئی کہ اس کو بیت الخلاء میں پہنچاؤں یہ تھا ان حضرات کا ادب جس کی برکت سے حق تعالیٰ نے ان کو درجات عالیہ عطا فرمائے تھے آج کل تو اخبارو رسائل کی فراوانی ہے ان میں قرآنی آیات، احادیث اور اسماء الٰہیہ ہونے کے باوجود گلی کوچوں، غلاظتوں کی جگہوں میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ العیاذ باللہ العظیم معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی دنیا جن عالمگیر پریشانیوں میں گھری ہوئی ہے اس میں اس بے ادبی کا بھی بڑا دخل ہے۔ (مجالس حکیم الامت،ص ۲۷۱،۲۷۲)

حروف کلمات کا ادب: ایک چمڑہ کا بیگ تھا، کسی مخلص خادم نے بنوایا تھا اور چمڑہ میں لفظ (محمد اشرف علی) کندہ کرا دیا تھا، اس کا حضرت (تھانوی) اتنا ادب کرتے تھے کہ حتی الامکان نیچے اور جگہ بے جگہ نہ رکھتے تھے۔ (حسن العزیز:۴/۳۲)

کتابوں کا ادب: آج کل طبیعتوں میں ادب بالکل نہیں رہا، مولانا احمد علی سہارن پوریؒ نے لکھا ہے کہ یہ جو بعض طلبہ بائیں ہاتھ میں دینی کتابیں اور دائیں ہاتھ میں جوتے لے کر چلتے ہیں بہت مذموم ہے کیوں کہ خلاف ادب ہے اور صورۃً جوتوں کو فوقیت دینا ہے، کتب دینیہ پر۔

(الافاضات الیومیہ:۹/۳۴۳)

روشنائی کا ادب: ایک لفافہ پر روشنائی گر گئی تھی تو اس پر یہ لکھ دیا کہ "بلاقصد روشنائی گر گئی" اور وجہ بیان فرمائی کہ یہ اس لیے لکھ دیا کہ قلت اعتناء پر محمول نہ کریں، جس کا سبب قلت احترام ہوتا ہے۔ (انفاس الوصل:۱۹۷)

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہوتی ہے

اگر آپ دنیا و آخرت میں عزت اور رضاء الٰہی کے طالب ہیں، تو اپنے اندر یہ صفات پیدا کیجیے۔

(۱) اخلاص (۲) لغو اور بیکار امور سے اجتناب (۳) علم پر عمل (۴) اخلاق حسنہ کو زندگی کا

لازمی جز بنائیں (۵) تواضع اور عجز اپنے اندر پیدا کریں۔ (۶) وقت کی قدر کریں۔ (۷) کھیل کود اور سیر وتفریح میں اپنا وقت گذارنے سے اجتناب کریں۔ (۷) بلند ہمت کا مظاہرہ کریں، اور علم وعمل میں درجہ کمال تک پہنچنے کی حتی المقدور کوشش کریں۔ (۸) مسلسل رات دن ایک کرکے محنت کریں۔ (۹) مطالعہ کا شوق پیدا کریں اور خوب دینی کتابوں کا مطالعہ کریں، اور اپنے آپ کو مطالعہ کا عادی بنائیں کہ مطالعہ کے بغیر چین نہ آئے۔ (۱۰) نمازوں کا اہتمام تکبیر اولی کے ساتھ کریں، امام ابو یوسف سترہ سال امام ابوحنیفہ کے درس میں فجر سے پہلے حاضر ہوتے تھے، کبھی ایک تکبیر اولی فوت نہیں ہوئی، امام اعمش کی ۷۰ ستر سال تک تکبیر اولی فوت نہیں ہوئی، یہ لوگ ہمارے لیے نمونہ ہے۔ (۱۱) نہایت درجہ استاذ، کتاب، آلات علم، اور مسجد کا ادب واحترام کریں، علم نافع کے آداب میں مسجد کا ادب بھی شامل ہے، مسجد میں باتیں کرنے سے بھی علم سے محرومی ہوتی ہے۔ (۱۲) نظر کی حفاظت کریں نظر بد سے حافظہ اور ذہانت کمزور ہوتے ہیں۔ (۱۳) گناہوں سے مکمل بچتے رہیں، کیوں کہ علم کا نور گناہوں کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ (۱۴) جھوٹ بولنے سے پرہیز کرے کیوں کہ وہ گناہ کبیرہ ہے۔ (۱۵) سبق میں بلا ناغہ حاضر رہیں، کیوں کہ ایک دن کی غیر حاضری بھی سبق کی برکتوں کو ختم کردیتی ہے۔ (۱۶) دعاؤں کا اہتمام کرے کیوں کہ دعاؤں سے راستے کھل جاتے ہیں، خاص طور پر ادعیہ ماثورہ کو یاد کرنے کا اہتمام کریں، اس لئے کہ وہ سریع الاجابہ ہے۔ (۱۷) صبح سویرے جلدی اٹھنے کا اہتمام کریں، کیوں کہ وہ برکت کا وقت ہے، دوگانہ پڑھ کر دعا کریں اور پھر سبق یاد کریں ان شاء اللہ بہت عمدہ اور بہت جلد یاد ہوجائے گا۔ (۱۸) بازاروں کے چکر نہ کاٹے کیوں کہ اس سے انسان پر شیطانی اثرات غالب آتے ہیں، اس لیے کہ بازار شیاطین کا اڈا ہوتے ہیں۔ (۱۹) پڑھنے کے ساتھ اپنے آپ کو لکھنے کا عادی بنائیں، مضامین اور مقالات اردو اور عربی میں لکھنے کی مشق کریں، تاکہ علم لوگوں تک پہنچایا جاسکے، اور عصر حاضر میں یہ بہت ضروری ہے۔ (۲۰) نحو صرف، فقہ، اصول فقہ، یہ ابتدائی درجات کے طلبہ خاص توجہ دے اور فقہ، حدیث، اور تفسیر پر منتہی طلبہ توجہ دے۔

اللہ رب العزت ہم سب کو علم نافع اور عمل صالح کی مکمل سعی پیہم کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ہمارے اسلاف کو بہترین صلہ عطا فرمائے، اور ہم سب کے لیے علم کو نجات کا باعث بنائے تاکہ ہمارے اوپر حجت۔ آمین یارب العالمین

مسلمانو! ہوشیار رہو، اپنا ایمان بچاؤ

کچھ عرصہ سے معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ نا سمجھ افراد یورپی ممالک میں جا کر سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو قادیانی ظاہر کر کے وہاں کے محکموں میں بیان حلفی داخل کراتے ہیں۔ اس کے پیچھے قادیانی لابی متحرک ہے۔ اس پر ہمیں کئی دفع لوگوں نے سوالات بھیجے ہیں

(۱)۔ کیا ایسا شخص مسلمان رہ جاتا ہے؟

(۲)۔ کیا ایسے شخص کے ساتھ کسی مسلمان لڑکی کا نکاح کیا جا سکتا ہے؟

(۳) اگر ایسا شخص پہلے سے شادی شدہ ہے تو کیا اس کی بیوی اس کے نکاح میں رہی یا نہیں، وہ اب کیا کرے؟

(۴)۔ کیا ایسے شخص کی توبہ قبول ہو سکتی ہے، اگر ہو سکتی ہے تو اس کی کیا شکل ہے؟

جواب

(۱)۔ امت مسلمہ اور پاکستان اسمبلی کے متفقہ فیصلے کے مطابق قادیانی غیر مسلم اقلیت ہیں۔ ان پر وہی احکام لاگو ہوتے ہیں جو کہ دوسرے تمام غیر مسلم لوگوں پر ہوتے ہیں۔ لہذا اگر کوئی شخص جناب محمد ﷺ کی ختم نبوت کا اقرار کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو غیر کے سامنے قادیانی ظاہر کرتا ہے تو ایک طرح سے علی الاعلان وہ عقیدہ ختم نبوت کا منکر ہے، وہ شخص نہ صرف دائرہ اسلام سے خارج ہے بلکہ مرتد بھی ہے۔

(۲)۔ کسی بھی غیر مسلم اور خصوصاً مرتد کے ساتھ مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں۔

(۳) اگر کوئی شخص شادی کے بعد قادیانی ہو گیا تو اس کی بیوی کا نکاح بروئے شریعت باقی نہیں رہا۔ وہ عورت اس مرتد سے طلاق لیے بغیر عدت پوری کر کے دوسرے سے نکاح کر سکتی ہے۔

(۴) ایسے شخص کی توبہ عام طریقہ سے قبول نہیں۔ اس کی توبہ صرف اس شکل میں قبول ہو سکتی ہے کہ وہ اسی محکمہ میں جائے جس میں اس نے پہلے اپنے آپ کو قادیانی بنا کر پیش کیا تھا۔ یہ کہے کہ میں نے آپ کے محکمے سے یہ جھوٹ بولا تھا کہ میں قادیانی ہوں۔ اب میں وضاحت کرتا ہوں کہ میں قادیانی نہیں ہو۔ اس کے بعد وہ توبہ کرے۔ اس کے بغیر توبہ قبول نہیں۔ کیونکہ قادیانی ہر سال اسی قسم کے محکموں سے لوگوں کے قادیانی ہونے کی تصدیق کروا کر دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے اپنی رپورٹ شائع کرتے ہیں کہ دیکھو اس سال اتنے لوگ قادیانی ہو گئے ہیں۔

منجانب۔ ابن انیس حبیب الرحمٰن لدھیانوی، فیصل آباد
مولانا حاجی اکرم شاد، نیویارک (امریکہ)

MONTHLY MAGAZINE **Millia** FAISALABAD PAKISTAN
JAMIA MILLIA ISLAMIA
Reg.M # FD-16
MOHALLAH KHALSA COLLEGE FAISALABAD Ph:041-8711569
E-mail: milliafsd@hotmail.com Fax # 041-8724335